ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

فروری ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۸ | جمادی الاولی ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	کارِ دعوت کی انجام دہی اور وعدۂ الٰہی	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	یہ ایک اہم سوال ہے	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	کوہ صفا کی چوٹی سے	محمد فرید حبیب ندوی	۸
۴۔	فکر معاصر	ماڈریٹ اسلام	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۰
۵۔	داستان عزیمت	اصحاب عزیمت	مولانا ابوالکلام آزادؒ	۱۲
۶۔	اسلامی تعلیمات	سماجی خدمت، ایک اہم اسلامی فریضہ	محمد قمر الزماں ندوی	۱۶
۷۔	تربیت اولاد	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۹
۸۔	نقد ونظر	اسلام پر وارد شدہ اعتراضات.....	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۲۵
۹۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۲۳)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۵
۱۰۔	انکار حدیث	بعض جدید اصحاب قلم اور حدیث پر اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۳۷
۱۱۔	قضیۂ فلسطین	اسرائیل کا قیام اور یہودی تصورات: ایک جائزہ	شان محمد ندوی	۴۲
۱۲۔	تجزیہ	اصل دہشت گرد کون؟	زین العابدین ندوی	۴۵
۱۳۔	شخصیات	عظیم فاتح حضرت خالد بن ولیدؓ	ترجمہ: محمد عالم ندوی	۴۹
۱۴	روداد	بے خبر کی خبر	سراج اکرم قاسمی	۵۳
۱۵	تعارف و تبصرہ	''عالم اسلام'' اور ''تصویر وطن''	حنیف خاں	۶۰
۱۶	آخری صفحہ	رب کعبہ کی قسم سچ ہے	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۷	شعر و ادب	وہ محفل جو اپنی سجائی ہوئی تھی.....	کلیم عاجزؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

یہ ایک اہم سوال ہے!

ہندوستان کی تاریخ میں شاید ایسا دور کبھی اور نہیں آیا جبکہ ہر شخص بے چین ومضطرب ہو گیا ہو، بالخصوص مسلمانوں پر متعدد مرتبہ حالات آئے اور ان کو کئی مرتبہ عبرتناک فسادات ومظالم اور صریح ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر یہ آزادی کے بعد سے اب تک کی تاریخ میں پہلا موقع ہے جبکہ ہر شخص سراپا سوال بن گیا ہے مگر جواب کسی کے پاس نہیں اور سوال کرنے کی بھی کسی میں جرأت نہیں، اگر چہ کچھ کرنے والے کر رہے ہیں اور کہنے والے کہہ رہے ہیں، مگر جب اقتدار کا نشہ پوری طرح چھا جاتا ہے تو نہ کسی کی بات سنی جاتی ہے اور نہ کسی کو جواب دیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ہماری قوم پوری طرح خوف وہراس کا شکار ہے، صورت حال بایں جا رسید کہ کوئی فریادرسی کرنے والا بھی نہیں، یکے بعد دیگرے شکستوں کا سلسلہ ہے، گئو رکشا، موب لینچنگ، زہر افشانی اور پھر بالآخر لوک سبھا میں پیش کیے گئے طلاق ثلاثہ بل نے لوگوں کے ہوش اڑا دیے ہیں، لوگ دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں، سچ پوچھیے تو یہ ابھی پریشانی کی ابتدا ہے، ''آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا''، مگر محض تماشائی اور ڈر کر بیٹھ جانا، گوشۂ عافیت تلاش کرنا اور قومی وملی مسائل سے جان بچانا زندہ قوموں کی علامت نہیں، ملت اسلامیہ تاریخ انسانی میں واحد ایسی امت ہے جس کی خصوصیت ''جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا'' ہے، کئی مرتبہ ایسا محسوس ہوا کہ یہ امت تاریخ کے صفحات میں دفن ہو جائے گی، مگر ہر مرتبہ اس امت نے ''ادھر ڈوبے ادھر نکلے'' کی تصویر پیش کی، اس امت کے لئے مایوسی اور خوف کی نفسیات کوئی معنی نہیں رکھتیں، کیوں اس کا تعلق جس دین سے ہے اس کو قیامت تک کے لئے برپا کیا گیا ہے، جو اس دین سے وابستہ رہے گا دنیا اس کی عظمت کو سلام کرے گی اور وہ تاریخ میں زندہ جاوید رہے گا، جو اس دین سے اپنا رشتہ توڑ لے گا اور اس کی تعلیمات کو اپنی خواہشات پر قربان کر دے گا تو یقیناً وہ نشان عبرت بن جائے گا۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کو کسی سازش، کسی قانون اور کسی بڑی سے بڑی طاقت سے کوئی خطرہ نہیں، جس اسلام کو ختم کرنے تاتاری اٹھے وہ خود ہی اس کے محافظ بن گئے، جس اسلام پر ضرب کاری لگانے کے لئے خلافت عثمانیہ کو اکھاڑ پھینکا گیا اور پھر گہوارۂ خلافت میں اسلام کو دیس نکالا دینے کی ہر کوشش کی گئی آج حقیقی معنی میں وہی ملک ہے جو اسلام کی صحیح ترجمانی کر رہا ہے، اس لیے اسلام کو کبھی بھی کسی سے نہ کوئی خطرہ تھا، نہ ہے اور نہ رہے گا، البتہ سوال یہ ہے کہ ہم رہیں گے یا نہیں،

ہماری شناخت رہے گی یا نہیں، ہماری عزت اور ہماری جان محفوظ رہے گی یا نہیں، خطرہ اصلا ہم کو لاحق ہے اسلام کو نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اپنا اور اپنی کارکردگی کا صحیح تجزیہ کریں اور پھر عمل کی مہم چھیڑیں، إن تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (محمد:۳۸) اور فرمایا گیا إلا تفعلون تکن فتنة فی الأرض وفساد کبیر (انفال:۷۳)۔

واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں ملک کے حالات بہت خراب ہیں، سب کے لیے خراب ہیں مگر سب سے زیادہ مسلمانوں کے لیے خراب ہیں، اتنے خراب ہیں کہ ملک کی تاریخ میں وہ واقعہ رونما ہو گیا جو اب تک نہیں ہوا تھا، ملک کی سپریم کورٹ کے چار سینیئر ججز بھی چیخ پڑے کہ اب اس ملک میں ''جمہوریت کو خطرہ لاحق ہے''۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ہمارے پاس کیا ہے؟ ہمارا یہ احساس ہے کہ اس ملک میں آزادی کے بعد سے اب تک ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ دوہرا رویہ اختیار کیا گیا لیکن قیادتیں مصلحت پسندی کے نام پر چند کلیوں پر قناعت کرتی رہیں، رفتہ رفتہ پوری قوم قومی دھارے Main stream سے باہر ہوتی چلی گئی، آر ایس ایس نے اپنے ہزاروں ادارے قائم کیے، تعلیمی اداروں میں اپنے ہرکارے چھوڑے، میڈیا پر رفتہ رفتہ تسلط حاصل کیا، تجارت و معیشت پر قبضہ جمایا، زندگی کے ہر میدان میں پاؤں پسارے، ۱۹۲۵ میں شروع کیے گئے سفر کو پوری خاموشی، تنظیم، ترتیب، ہوش مندی اور منصوبہ بندی کے ساتھ یہاں تک پہنچایا کہ آج ملک کے ہر شعبہ میں، حکومت کی پوری مشنری میں ۵۰ فیصد سے زائد ان کے نمائندے ہیں، جمہوریت کے چاروں ستونوں پر ان کا تسلط ہے، تقریبا ۹۰ سال کی منظم اور انتھک محنت کے بعد اب وہ اپنی تیار کردہ فصل کاٹ رہے ہیں، اور من مانے طریقے سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی ابتدا کر چکے ہیں، اس کے مقابلہ میں ہم آر ایس ایس سے خطرہ تو ضرور محسوس کرتے ہیں مگر تیاری کے نام پر صفر، ہم ابھی تک سیکولر و کمیونل کی بحث میں الجھے ہوئے ہیں، روحانیت و مادیت کا فلسفہ اب تک نہیں سلجھ سکا ہے، اسکول و مدرسے کی بحث سے اب تک نجات نہیں ملی ہے، مقابلہ آر ایس ایس سے ہے مگر اس کی طرح کوئی تنظیم اور کوئی ادارہ ہمارے پاس نہیں، ذرا غور کیجئے اتنے سارے مدارس اور اتنی ساری خانقاہیں اور تنظیمیں ہیں، لیکن کیا کسی نے اب تک افراد سازی کا عمل انجام دیا، حیرت انگیز بات ہے، بلکہ مدرسی نظام پر پھبتی کسنے اور ملی زبوں حالی کا الزام مدرسوں پر دھرنے والوں کے لیے مقام عبرت ہے کہ سپریم کورٹ میں صف اول کے وکیلوں میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے، سیاسی میدان میں ایک بھی باشعور اور تربیت یافتہ مسلمان نہیں ہے، سرکاری مشنری میں دینی اور ملی شعور سے آراستہ و تربیت یافتہ ایک بھی مسلمان نہیں ہے، مسئلہ خالص شرعی ہو مگر سہارا ان ہی اغیار کا، مسئلہ خالص ملی ہو مگر دہائی صرف ان ہی اغیار کی، سوچیے ذرا کہ ہم نے اب تک ''جمہوریت بچاؤ'' اور ''جمہوریت کو خطرہ ہے'' کے نعرے لگانے کے سوا کیا کیا ہے، ''اب یہ ناقابل برداشت ہے''، ''ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے''، ''اب ہم برداشت نہیں کریں گے'' ان کھوکھلے جملوں کے سوا ہمارے پاس اور کیا ہے، ہمارے شعور کا عالم یہ ہے کہ ہم ایک تقریر پر

پھولے نہیں سماتے، چند جملوں پر ہم جس کو چاہتے ہیں ہیرو بنا دیتے ہیں اور جب دل چاہے ایجنٹ قرار دے دیتے ہیں، ہماری صورت حال یہ ہے کہ ہم آج بھی منفی سوچ کے ساتھ جی رہے ہیں، ہمیں نہ تبدیلیوں کا احساس ہے اور نہ خطرات کا ادراک، ہم آج بھی اپنی ترجیحات نہیں طے کر سکے ہیں اور نیم سیاسی عمل یا جز وقتی سیاست کا مزا لے رہے ہیں، ہمارے کاموں میں تنظیم، ترتیب اور باہمی ربط وتعاون نیز منصوبہ بندی کا سرے سے فقدان ہے، ہم آج بھی جلسہ کلچر کے سہارے زندہ ہیں، ہمارے یہاں افراد سازی کا عمل کسی تنظیم اور کسی ادارے میں نہیں ہوتا، بقول ایک مبصر کے ''جس عمر کے نوجوانوں کو سیاسی پارٹیوں میں قیادت دی جاتی ہے ہمارے یہاں اس عمر کے عقل و دانش رکھنے والے لڑکوں کو ناسمجھ کہہ کر کنارے کر دیا جاتا ہے، اور ہر تنظیم اور ہر ادارے میں اپنی وراثت کو باقی رکھنے کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کو تمام تر نااہلی و بے استعدادی پر ترجیح دی جاتی ہے''، جس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں بس اللہ کا ہی سہارا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ تب ہی سہارا دیتا ہے اور اس کی نصرت تب ہی آتی ہے جب دارالاسباب میں صحیح طریقے سے اسباب اختیار کیے جائیں، دنیا معجزات سے نہیں چلتی بلکہ یہ دنیا سنت اللہ کی پابند ہے، جب قانون الٰہی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں تو نصرت الٰہی بھی دستگیری کرتی ہے، لیکن بدقسمتی سے ہماری قوم کو مادیت و روحانیت کے عنوان سے دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا، روحانی لوگ نظام دنیا سے ناواقف اور ایسے لاتعلق ہو گئے کہ ہر میدان کو دوسروں کے حوالے کر کے سارے کام دعا سے حل کرانے لگے، قرآن کے واضح بیانات اور سیرت نبوی کی رہنمائیوں کو چھوڑ کر عوام کو قصے کہانیوں اور خرق عادت واقعات اور خوابوں سے بہلانے کا عمل ہونے لگا، یقیناً دعا کے ذریعہ ہر ناممکن ممکن ہو سکتا ہے اور خرق عادت واقعات بھی رونما ہو سکتے ہیں، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قانون الٰہی یہ نہیں ہے، دوسری طرف جنہیں مادیت کا طعنہ دیا گیا وہ دینی شعور سے اس طرح خالی ہوئے کہ جب وہ کسی لائق ہوئے تو خود اپنے ہی مذہب اور اپنے ہی لوگوں کے درپہ آزار ہو گئے، وہ ایسے بے قابو ہوئے کہ نشہ آور خواب بھی ان کو قابو میں نہ کر سکے اور انہیں روحانیت کے دائرے میں نہ لا سکے۔

ابھی بھی اس اس ملک میں مسلمانوں کے پاس وقت ہے کہ وہ سنبھل سکیں، سنبھلنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ سے سبق حاصل کریں، صحیح سمت میں سفر شروع کریں اور افراد سازی کریں، گزشتہ صدی کی ترکی کی تاریخ پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ جب مسلمان اس قدر مجبور ہو گئے کہ اپنے اللہ کا نام لینے پر بھی ان کو سزا دی جانے لگی تب بھی وہ خاموشی سے افراد سازی کرتے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ موقع ملتے ہی وہ سارے افراد میدان میں آ گئے، باطل کا مقابلہ کرتے رہے اور ڈوبنے ابھرنے کا عمل جاری رہا، حیران کن بات یہ ہے کہ میدان سیاست کے یہ بڑے بڑے سورما خانقاہ کے صوفیوں کی آغوش میں پلے بڑھے، ''مدارس امام و خطیب'' میں ان کو قیادت کا اہل بنایا گیا، ۱۹۲۵ء میں اتاترک کے خلاف ہونے والی مسلح بغاوت جو ۹ ماہ تک مسلسل جاری رہی اس

کی قیادت سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک صوفی بزرگ شیخ سعید بیران نے کی، اس میں ناکامی اور بڑے پیمانے پر قتل وغارت اور سزائے موت سے دوچار کیے جانے کے بعد سارے صوفیا اور علماء خاموشی سے افراد سازی میں مشغول ہوگئے، گردش ایام کے ساتھ ان کا یہ بنیادی اور پختہ عمل جاری رہا، جب عالمی حالات کے سبب ترکی کی سیاست میں بھی تبدیلی آئی تو ان تربیت یافتہ افراد نے مورچہ سنبھالا اور آج ملک کو اس سطح پر لے آئے کہ جہاں کلمۂ اسلام زبان پر آنے سے جیل ملا کرتی تھی وہاں سے آج ہر موقع پر اسلامی موقف کی پوری مضبوطی کے ساتھ وکالت کی جاتی ہے، کیا اس طرح کے کچھ افراد کی ذہن سازی اور کردار سازی ہمارے یہاں کی گئی؟ یہاں تو پریشانی یہ ہے کہ نہ صرف ایسے افراد نہیں تیار کیے گئے بلکہ بلاواسطہ سیاسی عمل سے مکمل اجتناب کیا گیا اور بالواسطہ مگر غیر مشروط شرکت بھی رہی، سیاسی عمل سے بے اعتنائی کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا گیا کہ ہماری تمام مشکلات سیاست سے دور رہ کر حل ہوجائیں گی، یہ وہ سنگین غلطی تھی جو تا حال جاری ہے، اور پے در پے ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی ہمیں ہوش نہیں آرہا ہے، یہ اس اعتبار سے بڑا سنہرا موقع ہے جب سیکولر کمیونل سب کے چہرے سامنے آگئے تو مسلمان خاموشی اور منصوبہ بندی کے ساتھ ٹھوس سیاسی محاذ کی تیاری میں مشغول ہوجائیں تاکہ آئندہ کے لئے ان کا کوئی سہارا تیار ہوسکے۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب تک دعوتی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی میدان میں ہماری کوششیں باہم مرتبط، منظم اور منصوبہ بند نہیں ہوں گی تب تک نہ ہماری تفسیات بدلیں گی، نہ حال بدلے گا نہ مستقبل کے محفوظ ہونے کی کوئی ضمانت ہوگی، ہمیں دعوت کو نبوی منہج کے مطابق اختیار کرنا پڑے گا، اپنا اور اپنے دین کا تعارف کرانا پڑے گا، اس حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرانا ہوگا کہ ہم کو انسانیت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تعلیمی میدان میں ہمیں اب تفریق کی نفسیات سے نجات حاصل کرنی پڑے گی، اہل مدرسہ کو قومی دھارے میں شامل ہونے کی اہلیت حاصل کرنی پڑے گی اور نصاب میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کرنے کے ساتھ اسکولوں کے طلبہ کو افراد ملت بنانا ہوگا، ان میں دینی اور ملی شعور پیدا کرنا ہوگا، سچ پوچھیے تو ایسے ادارے قائم کرنے ہوں گے جن میں سیرت اور ترجمہ قرآن کے ساتھ بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ عصری علوم سے طلبہ کو آراستہ کیا جائے، ان کی ذہن سازی کر کے انھیں میدان میں اتارا جائے، ہم کو اقتصادی میدان میں بھی ملت کو مضبوط بنانے کی وہ تمام کوششیں کرنی ہوں گی جو ممکن ہیں (یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لیے ہم مختصراً اشارے کر رہے ہیں)، سیاسی اعتبار سے ہم کو کسی جماعت کا غلام بننے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی فکر کرنا ہوگا، ہم نے آزادی کے بعد سب سے بڑی غلطی یہ کی ہم خود تو سیاست سے دور ہوگئے اور قوم کو کانگریس کا غلام بناڈالا، جبکہ کانگریس نے ہمیں اس حال میں پہنچایا کہ ہماری حالت شودروں سے بدتر ہوگئی، کانگریس کا تو کچھ نہیں بگڑا اور نہ بگڑے گا، لیکن مسلمانوں کا مستقبل یکسر تاریک نظر آتا ہے، اب بھی وقت ہے کہ مسلمان کانگریس کو سیکولر سمجھ کر ''عقیدے'' کا حصہ سمجھنے کی غلطی سے باز آئیں اور جنگی پیمانے پر مہم چھیڑ کر ملک بھر کی دلت آبادی کو ساتھ لے کر ایک نیا محاذ قائم

کریں، اگر چہ اس کا نتیجہ شدید محنت اور بڑی جانفشانی کے باوجود دیر سے آئے گا مگر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوموں کی زندگی میں دس بیس سال کی کوئی اہمیت نہیں، اس ملک کی سیاست میں مسلمانوں کے ''مؤثر کردار'' بننے کی صرف یہی ایک صورت ہے ورنہ ان کے ووٹ کی اہمیت کو تو ختم کیا ہی جا چکا ہے، ووٹ کا حق بھی چھین لینے اور دستور میں ترمیمات کرنے کا خطرہ سامنے ہے۔

آخری اور انتہائی اہم بات یہ ہے کہ جب تک ہم ان چاروں میدانوں میں باہمی تعاون اور منصوبہ بندی کے ساتھ محنت نہیں کرتے اور افراد سازی کا عمل شروع نہیں کرتے ہمارے لیے کسی طرح کی اچھی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ___ ہمیں ہرگز نہ دعویٰ کمال ہے اور نہ مستقبل کا کوئی علم ___ لیکن ہمارا ناقص مطالعہ یہ کہتا ہے کہ منصوبہ بندی اور منظم کوشش کا فقدان، سیاسی عمل سے اہل دین کا اجتناب اور اس سے جزوقتی دلچسپی اور ان چاروں شعبوں میں سنجیدہ کوششوں کا نہ ہونا ملت کی زبوں حالی اور دن بدن ابتری کا سبب ہے، جو لوگ بھی اس کے ذمہ دار ہیں انھیں پوری سچائی کے ساتھ ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے اور آنے والے دنوں کے بھیانک انجام سے قبل ''اعداد قوت'' پر عمل پیرا ہونے کے لئے افراد تیار کرنے کی مہم چھیڑنی چاہیے اور ان چاروں اہم میدانوں کو منظم طریقے سے جلسہ کلچر سے دور رہتے ہوئے میدان عمل بنالینا چاہیے۔

یہ ایک اہم سوال ہے کہ اپنے آپ کو تمام شعبہائے زندگی سے الگ کر کے، افراد سازی کے عمل سے اجتناب کر کے، مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں ملی نمائندگی اور تربیت یافتہ افراد سے محروم رہ کر، کیا یہ ممکن ہے کہ قوم کو دیگر اقوام کے درمیان کوئی مقام مل سکے؟؟۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

□ پیام سیرت

کوہِ صفا کی چوٹی سے

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''تیرا برا ہو......کیا تو نے ہمیں اسی لئے بلایا تھا؟''

وہ آج صبح بیدار ہوا تو طبیعت کچھ زیادہ ہی بے چین تھی۔

دل تھا کہ درد سے پھٹا جا تا تھا۔

اس کے گرد وپیش کا ماحول ایسا تھا کہ وہ ہر ایک سے اپنا درد بیاں بھی نہ کرسکتا تھا۔

کئی سال سے وہ اسی درد کے ساتھ جی رہا تھا۔

کوئی تنہائی میں ملتا......اسے لگتا کہ یہ بھروسہ کا آدمی ہے......تو وہ اس سے اپنی بات کہہ دیتا۔

اور وہ بات کوئی ایسی نہ تھی جس میں اس کا ذاتی فائدہ ہو............فائدہ تو سارا دوسروں کا ہی تھا۔

مگر ہے نہ تعجب کی بات!

جن کے فائدے کی بات تھی......وہ ان سے بھی بیاں نہ کرسکتا تھا!

ایسا ہی ہوتا رہا ہے......ایسا ہی اُس وقت ہو رہا تھا......اور ایسا ہی آج ہو رہا ہے۔

ایسے مخلصوں کا درد بہت کم لوگ ہی محسوس کر پائے ہیں۔

جب بھی انھوں نے لوگوں کے فائدے کی بات کی......زمانہ ان کا دشمن ہوگیا۔

ان کے دل کی کسک......آہ!......

ان کی جگر کاوی......ان کی پتہ ماری کو...... یہ نادان زمانہ سمجھ ہی نہ سکا۔

اگر سمجھتا تو......انھیں پلکوں پہ بٹھاتا......آنکھوں میں سجاتا......اور......دل میں بساتا۔

اگر سمجھتا تو......ان کے جسموں پر خراش نہ لگاتا......ان کے پاکیزہ لہو کی بوندیں نہ ٹپکاتا......ان کے عرقِ جبیں کا مذاق نہ اڑاتا......ان کے نازک دل کو پارہ پارہ نہ کرتا۔

اگر سمجھتا تو......ان سے نفرت نہ کرتا......انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالتا......ان کے مسکراتے چہروں پر غم کی لکیریں نہ کھینچتا۔

آہ! ......زمانہ انھیں سمجھ نہ سکا......ان کی قدر نہ کرسکا......ان کے مقام کو پہچان نہ سکا۔

وہ بھی اُن میں سے ہی ایک تھا۔

یہ ظلم اس کے ساتھ بھی کیا گیا......اور سب سے بڑھ کر کیا گیا۔

تاریخ آج پھر اپنے آپ کو دوہرا رہی تھی......زمانہ ایک بار پھر اپنی بدبختی کا اظہار کررہا تھا۔

ایک بار پھر کسی کا دل ٹوٹا تھا......ایک بار پھر عرش الٰہی ہلنا تھا......اور......ایک بار پھر فرشتوں پہ گریہ طاری ہونا تھا۔

مگر آہ!.....اس بار شیشۂ نازک پر سنگ باری کرنے والا کوئی اور نہیں.....اپنا تھا۔

آج اس نے اپنا یہ درد سب کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

دن چڑھے وہ ایک پہاڑی پر چڑھا.....اور وہاں سے منادی عام کی:

''اے لوگو! ذرا میری بات سنو''۔

اس کی آواز جانی پہچانی تھی.....اور وہ.....سب کا منظورِ نظر تھا۔

ذرا سی دیر میں نیچے میدان میں ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔

''لوگو! بتاؤ.....میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''۔

اس نے پہلے سب سے اپنی تصدیق کا اعلان کروانا چاہا۔

''تم سچے ہو.....تم امین ہو.....''۔

ایک ہی آواز سب کی زبان سے بلند ہوئی۔

''اچھا تو سنو.....میں تمھیں اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں.....اور ایک اللہ کو ماننے کی دعوت دیتا ہوں''۔

بس اتنا کہنا تھا کہ مجمع چھٹنے لگا۔

اسی افراتفری میں ایک دل شکن آواز ابھری:

''تیرا برا ہو.....کیا تو نے ہمیں اسی لئے بلایا تھا''۔

یہ آواز کیا،.....زہر میں بجھا ہوا ایک خنجر تھا.....ایک تیز نم کش تھا جو اس کے دل میں پیوست کیا گیا۔

اس کے موم سے دل کو کچل دیا گیا۔

آہ!.....یہ تیر و نشتر چلانے والا کوئی اور نہیں.....اس کا سگا چچا تھا۔

دوسروں کا دیا ہوا غم بھی غم ہوتا ہے.....مگر اپنوں کا دیا ہوا غم تو زہر ہلاہل بن جاتا ہے۔

یہ واقعہ مکی دور کی ابتدا کا ہے.....تین سال خفیہ دعوت دینے کے بعد ایک دن آپ ﷺ کوہِ صفا پر تشریف لے گئے اور ایک منادی کے ذریعے لوگوں کو وہاں جمع کر کے ان کے سامنے توحید کی دعوت رکھی.....مگر کسی ایک نے بھی آپ کی دعوت قبول نہ کی، سب تو خاموش رہے، مگر آپ کے چچا نے سرِ محفل آپ کو برا بھلا کہا۔

اس واقعے میں درس و عبرت کے بے شمار پہلو ہیں:

دعوتی جشن آپ ﷺ کی زندگی کا اصل مشن تھا۔ یہی مشن آپ کے جانشینوں کا بھی ہونا چاہیے۔

مگر لگتا ہے کہ وارثین خاتم المرسلین آج اس مشن کو فراموش کر بیٹھے ہیں.....اور شاید دل کے کسی گوشے میں ڈر یہ بیٹھ گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں ہمیں طعنے ملیں گے.....گالیاں دی جائیں گی.....دل شکن جملے کسے جائیں گے۔

مگر رسول پاک ﷺ کی زندگی کا یہ واقعہ ہم سے بہت کچھ کہتا ہے.....اور اس کی سلوٹوں میں ہم سے ایک خاص خطاب ہے.....اور وہ یہ کہ اے میرے وارثو! یہ راہ اگرچہ کانٹوں بھری ہے، مگر یہ میری راہ ہے، اس میں میں نے بھی بہت تکلیف برداشت کی ہیں.....تم بھی میری اس راہ پر چلتے رہنا اور اس کے لئے ہزار آلام و مصائب بھی برداشت کرنا پڑیں تو دریغ نہ کرنا۔ یہی میری حقیقی وراثت اور سچی جانشین ہے۔

☆☆☆

❑ فکرِ معاصر

ماڈریٹ اسلام

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

لوگ ہر نئی اصطلاح سے وحشت زدہ ہوجاتے ہیں، ماڈریٹ اسلام کی اصطلاح صرف لفظی اعتبار سے نئی ہے لیکن اپنے مفہوم اور روح کے اعتبار سے ماڈریٹ اسلام سیکڑوں سال پرانی چیز ہے، یہ پرانی شراب ہے جسے نئے ساغر میں پیش کیا جارہا ہے۔ ماڈریٹ اسلام کا مطلب ہے دین اسلام کو عصری تقاضے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وقت کے عقلی معیار کے مطابق پیش کرنا۔ اسلام کی تاریخ میں اس دین کو عقل کے معیار کے مطابق پہلے معتزلہ نے پیش کیا تھا جس کا بانی واصل بن عطا تھا، دوسری ہجری کے آخر میں یہ فرقہ وجود میں آیا تھا، اس گروہ کے نزدیک اللہ کی تمام صفات مخلوق ہیں اور قرآن مخلوق ہے، کیونکہ کلام الٰہی کو مخلوق نہیں بلکہ قدیم مانیں گے تو تعدد قدماء لازم آئے گا اور یہ غلط ہے، توحید کے لئے بس عقلی دلائل کافی ہیں، اس مذہب کی بنیاد عقل پر ہے اور عقل کو نقل پر ترجیح حاصل ہے، یہ قدیم دور کا ماڈریٹ اسلام تھا، امام احمد بن حنبل اور مستند علماء نے معتزلہ کا بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا تھا، عقل کو واحد حکم یعنی فیصل ماننے کا زمانہ بہت طویل رہا ہے، ائمہ اربعہ کے دور کے بعد ابن رشد اور ابن سینا عقلیت کے علم بردار بن کر سامنے آئے، یہ یونانی فلسفہ کے عروج کا زمانہ تھا، جدت فکر کی اس نئی لہر کا مقابلہ امام غزالی نے کیا اور یونانی فلسفہ کو چیلنج کیا کیونکہ اس آزادانہ فکر کے نتیجہ میں مذہبی معتقدات خطرہ میں پڑ رہے تھے، کیونکہ بہت سے مذہبی معتقدات مخالف عقل تو نہیں تھے لیکن ماورائے عقل ضرور تھے۔ جنت دوزخ آخرت کوئی چیز مخالف عقل نہیں لیکن ماورائے عقل ضرور ہے۔ واصل بن عطاء اور معتزلہ کا جو اسلام تھا آج کی اصطلاح کے اعتبار سے ماڈریٹ اسلام تھا یعنی اسلام کا اور خیر وشر کی پرکھ کا معیار عقلی دلائل کو بنایا گیا تھا اور لکیر کے فقیر بننے کی مخالفت کی گئی تھی۔ امام غزالی نے یونانی فلسفہ کا زور نہ توڑا ہوتا تو اسلام کی تاریخ میں ویسی ہی عقلی بغاوت ہوتی جیسی مسیحیت کی تاریخ میں رونما ہوئی، یعنی ایک مارٹن لوتھر پیدا ہوتا جس نے کیتھولزم کے مقابلہ میں پروٹسٹنزم کا عقیدہ پیش کیا تھا جو گویا احتجاج اور پروٹسٹ تھا، مارٹن لوتھر نے جو عقیدہ پیش کیا تھا وہ گویا ماڈریٹ عیسائیت کا عقیدہ تھا، مارٹن لوتھر ایک جرمن راہب تھا اور اس نے پاپائیت کے خلاف تحریک چلائی تھی یہ ایک غریب گھرانے میں ۱۴۸۳ میں پیدا ہوا، اس نے پوپ کی شدید مخالفت کی پوپ کے معافی نامہ کو باطل کیا معافی نامہ یا مغفرت نامہ پوپ کی طرف سے جنت میں داخلہ کے لئے کسی شخص کو دیا جاتا تھا اور جس شخص کو یہ مل جاتا اسے جنت کی ضمانت ہوجاتی وہ زمرہ مبشرہ میں شامل ہوجاتا۔ اس لئے یہ مغفرت نامے اہل ثروت بڑی بڑی قیمت دے کر خریدتے تھے، پوپ نے واقعی بڑے احمقانہ کام کئے تھے اس لئے مارٹن لوتھر کی تحریک بہت مقبول ہوئی، مارٹن لوتھر نے ایک عہد نامہ جدید بھی ایجاد کیا یعنی ایک نئی آسمانی کتاب جس میں حالات کے لحاظ سے احکام میں تبدیلی ہوسکتی تھی، مارٹن لوتھر کی تحریک کیتھولک چرچ کے مقابلہ میں عقل کی کسوٹی پر زیادہ پوری اترتی تھی اس لئے اسے ماڈریٹ عیسائیت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسلامی دنیا میں ماڈریٹ اسلام کو سمجھنا ہو تو ترکی کے کمال اتاترک کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے جس نے ترکی کا عربی رسم الخط بدل کر کے رومن رسم الخط کو جاری کیا اور ہر ترکی نوجوان کے سر سے ترکی ٹوپی ہٹا کر اسے ہیٹ پہنا دیا اور اذان تک ترکی زبان میں دینے کے احکام جاری کئے۔ ماڈریٹ اسلام عصر حاضر میں مغرب زدہ اسلام کا مرادف بن گیا ہے۔ کیونکہ عصر حاضر

میں عقلیت کا معیار تو مغرب ہی ہے۔

ماڈریٹ اسلام کو اور زیادہ قریب سے سمجھنا ہو اور عصر حاضر کے تناظر میں سمجھنا ہو اور ہندوستان کے اندر اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو ہندوستان کی عظیم شخصیت سرسید کے افکار اور خیالات کا جائزہ لینا کافی ہوگا جن پر کافی لکھا گیا ہے اور کافی ان کو خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے اور وہ خراج عقیدت کے مستحق بھی ہیں۔ مارٹن لوتھر نے جس طرح وحی کے بجائے عقل سے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی تھی سرسید نے بھی عقل کو چراغ راہ اور اپنی منزل قرار دیا۔ پیغمبروں کے معجزات مخالف عقل تو نہیں لیکن ماورائے عقل ضرور ہیں اور چونکہ وہ عقل سے نہیں سمجھے جاسکتے اس لئے سرسید نے معجزات کا انکار کیا انہوں نے مارٹن لوتھر کی طرح عقل کو اپنا رہنما بنایا اور جو چیز عقل کے معیار پر پوری نہیں اترتی اس کا انکار کیا، مفسرین کی کتابوں پر اپنی بے اعتمادی ظاہر کی اور ان کی قرآن فہمی پر سے بے اعتمادی کا اظہار کیا اور انگریزوں کو غیر معمولی طور اپنی عقیدت اور محبت کا نذرانہ پیش کیا اور ان کی تہذیب اور تمدن کی خوب جی کھول کر تعریف کی اور اسے مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل قرار دیا۔ یہ سب ماڈریٹ اسلام کے اور مغربی تہذیب کی پذیرائی کے نمونے ہیں۔ یعنی جہاں اسلام اور مغربی تہذیب کا پیوند لگانے کی کوشش ہو وہاں ماڈریٹ اسلام کا ہیولی ضرور تیار ہوگا۔

اب ماڈریٹ اسلام کا ایک اور ماڈل مرکز اسلام کی سرزمیں سے ابھرنا شروع ہوا ہے۔ یہاں بھی مغربی تہذیب کی پذیرائی ہے، یہاں بھی عقل امریکہ اور مغرب کے آستانہ پر سجدہ ریز ہے۔ یہاں بھی لوگوں نے ہمدردی کے ساتھ اس کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے لیکن اگر فکر ونظر میں تھوڑی سی بھی وسعت ہوگی تو زبان شکوہ سنج ہونے کے بجائے شکر گذار ہوگی۔ جس دیس میں ہمیشہ سے فلم جیسی ''نعمت'' سے اپنے باشندوں کو محروم رکھا گیا وہاں تین سو سینما ہاوس قائم کئے جارہے ہیں یہ ہے ماڈریٹ اسلام کا سب سے اعلی اور ارفع نمونہ۔ غور کیجئے ایک شخص دور دراز کے ملک سے آئے پھر عمرہ کرے، طواف اور سعی میں اپنے کو ہلکان کرے، تھک کے چور ہو جائے اب اگر وہ اپنی خستہ جانی کو آرام دینے اور ذہنی تھکان کو دور کرنے کے لئے قریب کے کسی سینما ہاوس میں فلم ''پدماوتی'' دیکھنے چلا جائے یا اگر عرب ہے تو مصری فلم ''المرأۃ الخائنۃ'' کا مشاہدہ کرنے کے لئے ایک آرام دہ سینما میں جا کر بیٹھ جائے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے، یہ تو ''تسکین دل محزوں'' کے لئے اور ''راحت جسم وجاں'' کے لئے محفل کیف ومستی میں تھوڑی دیر کے لئے خوش وقت ہونا ہے اور دلشاد ہونا ہے۔ کہاں قرآن اور حدیث میں لکھا ہوا ہے کہ فلم دیکھنا حرام ہے۔ لوگوں کو تاجدار مملکت اور ان کے ولی عہد کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے باشندگان ملک اور زائرین حرمین اور حجاج کی ''راحت رسانی اور آسودگی ذہنی وجسمانی'' کا غیر معمولی انتظام کیا ہے اور ماڈریٹ اسلام کی مثال قائم کردی ہے، ان کے یہ ''روشن کارنامے'' بھلائے نہ جائیں گے۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور تمام مصلحین امت کی روح خوش ہوگئی ہوگی، وہ بقید حیات ہوتے تو تمام تھیٹر کا افتتاح کرنے کے لئے پہونچتے اور ولی عہد کو ہار پہناتے۔ حضور ولی عہد سلطنت کو حرم سے بالکل متصل سینما گھر تعمیر کرنا چاہئے اس کی وجہ یہ ہے حضور ولی عہد کی طرح سارے مسلمان روشن خیال اور معتدل اسلام کے نظریہ ساز تو نہیں ہو جائیں گے، فلم دیکھ کر باہر نکلنے والے خوف زدہ رہیں گے کہ کہیں کوئی کٹھ ملا حضرت شیخ وواعظ کے قسم کا مسلمان انہیں دیکھ نہ لے، حرم کے قریب بالکل متصل یہ سینما گھر ہوگا تو بہانہ ہاتھ آئے گا کہ ہم ادھر نماز پڑھنے یا طواف کرنے آئے تھے۔ یہ وہ حکمت عملی ہے جو مرحوم داغ دہلوی کے شعر سے ہماری سمجھ میں آئی ہے:

میخانہ کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر شخص پوچھتا تھا کہ حضرت ادھر کہاں

معلوم ہونا چاہئے کہ کٹر پن اور راسخ العقیدگی کے پرچم بردار اور ماڈریٹ اسلام سے بیزار شیوخ وزہاد ہر جگہ پائے جاتے ہیں، دنیا ان سے کبھی خالی نہیں ہوگی، اقبال بھی ان سے عاجز تھے، چنانچہ چپ نہ رہ سکے اور کہہ اٹھے:

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

☆☆☆

❑ داستان عزیمت

اصحاب عزیمت

مولانا ابوالکلام آزادؒ

پس پہلا درجہ ہر حال میں ''السابقون السابقون'' و''منفقون الاولون'' اور ''اسبقون بالخیرات'' و''مجاھدون بالعمل والجوارح'' کا ہے جو جماعت ''مقتصد'' پر بھی شرف و مزیت رکھتے ہیں، اور ضعفاے طریق تو ان کے جولانِ کمال کی گرد و غبار بھی نہیں پا سکتے اور پھر جس طرح ہر قسم و جماعت میں حسبِ حال و استعداد، فرقِ مراتب و معارج ہوتا ہے، اسی طرح سابقون بالخیرات کے بھی مختلف مراتب و مقامات ہیں اور کتاب و سنت نے ان کے حالات و علائم بتلائے ہیں، ازاں جملہ سب سے اعلیٰ و اشمل طبقہ ان اخص الخواص نفوسِ مزکی کا ہے، جن کو قائد توفیقِ الٰہی و سائق فیضانِ ربانی عزائم امور کے لیے چن لیتا ہے کہ ان ذلک لمن عزم الامور اور جن کا نورِ علم و عمل مشکوۃ نبوت سے ماخوذ، اور جن کا قدم طریق منہاج نبوت پر واقع ہوتا ہے، انہی افرادِ خاصہ کو حدیث بخاری میں محدَّث (بالفتح) کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور یہی مورد و مصداق حدیثِ مجدد کے ہیں جو مختلف طریق سے مروی، اور اس لیے بلحاظِ صحت متن اس کی صحت میں کلام نہیں، یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظام وہدایت کا مقوم و منظّم ہے، اور انبیاے کرام کی اصلی وراثت انہی میں منتقل ہوتی ہے، البتہ یہ مقام از بس ارفع و اعلیٰ ہے اور ہر عہد و دور میں صرف چند نفوسِ عالیہ ہی ایسے ہوتے ہیں جن کا قدمِ ہمت امتحان گاہِ مصائب و مہالک سے آگے بڑھ کر وہاں تک پہنچتا ہے اور اپنے عہد کے سب سے بڑے عملِ حق کو انجام دے دیتا ہے، اس کے لیے نہ تو مجرد علم و تدریس کتب کام آتی ہے، نہ رسوم و بیئات زہد و انقطاع، نہ مدارس و معاہد دینی کے غلغلہ و ہنگامۂ فضیلت کو اس میں دخل ہے اور نہ صومعہ و خانقاہ کے گوشۂ انزوا کو، ان کے عہد میں علماء و اصحاب مشیخت کی کمی نہیں ہوتی، اور کچھ یہ بات بھی نہیں کہ مدرسے اجڑ جاتے ہوں اور خانقاہیں منہدم ہو جاتی ہوں، بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کثرت و شہرت کے لحاظ سے ان کا زمانہ علماء و مشائخ امت کا سب سے بڑا مجمع و ماویٰ ہوتا ہے اور آبادیوں کی آبادیاں اصحاب علم و پیشوائی سے بھری نظر آتی ہیں، تاہم مقامِ عزیمت دعوت و قیام ہدایت کی ان میں سے کسی کو بھی توفیق نہیں ملتی۔ کوئی دامنِ رخصت میں پناہ لیتا ہے، کوئی گوشۂ انزوا و انقطاع میں صرف اپنی عافیت و حفاظت ڈھونڈھتا ہے، کوئی راہ میں فتنہ و فساد کا شور سن کر صرف اسی کو کافی سمجھ لیتا ہے کہ اپنا دروازہ بند کر لے، کسی پر اضعف الایمان کا درجۂ تنزل و تسفل اس طرح طاری ہو جاتا ہے کہ زبان کو یکسر گنگ اور دستِ عمل کو یک قلم شل پاتا ہے، اور کسی کو نفسِ خادع اور خاطرِ فاسد ضلالتِ حیل و نفاق میں مبتلا کر کے سرگرمِ دنیا پرستی و دین فروشی کر دیتا ہے، غرض کہ سب کے سب یا ناچارِ مقامِ رخصت ہوتے ہیں یا واماندۂ ضعف و بیچارگی اور یا مدہوش غفلت و ہوا پرستی، ان میں سے ایک حصۂ غالب تو علماے سوء اور دعاتِ فتن و منکرات

کے زمرے میں داخل ہوجاتا ہے علماً وعملاً ، اور جو جماعت علمائے حق کی باقی رہتی ہے، وہ بھی ضعف کدۂ رخصت سے قدم باہر نہیں نکالتی اور حق پرستی کی بڑی سے بڑی بات اور تقویٰ وطہارت نفس کی بڑی سے بڑی فضیلت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اپنے قدم کو لغزش نہ ہو، اور جب کہ ایک دنیا امواجِ ظلمت وفساد میں ڈوب رہی ہے تو ہم کنارۂ سلامتی پر قدم جمائے باقی رہ جائیں، گویا ایمان کا جو سب سے ادنیٰ اور نچلا درجہ عامۂ ناس اور ضعفائے عمل کے لئے تھا، وہی خواص امت اور ہدات اور مرشدین ملت کے لیے بلندی وعروج کا سب سے اونچا مقام ہوجاتا ہے، اور سب سے بڑا متقی انسان وہ سمجھا جاتا ہے جس کے قدم ''جہادِ بالقلب'' کی پائین بساط سے پیچھے نہ ہٹیں، لیکن کوئی نہیں ہوتا جس کا عزم ایمانی توقف وسکون کی جگہ طالب اقدام وسبقت ہو، جو اپنے نفس کی نجات کی جگہ جماعت وامت بلکہ نوع وارض کی نجات کا عشق رکھتا ہو، جس کا حوصلہ کار اور عزم راہ صرف اتنے ہی پر قانع نہ ہوجائے کہ خود نہیں ڈوبا، کیوں کہ یہ تو ضعف وبیچارگی کا سب سے آخری درجہ ہے؛ فضیلت وکرامت اس میں کیا ہوئی؟ بلکہ ہر وجود کا ڈوبنا اس کے لیے ماتم اور ہر قدم کی ٹھوکر اس کے لیے موت ہو، جب کہ دنیا اس کو سب سے بڑی بڑائی سمجھ رہی ہو کہ خود کنارے پر بچ جائیں، تو وہ بتلادے کہ خود بچنا نہیں بلکہ ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لیے سمندر میں کود پڑنا بڑائی ہے، اور جب کہ لوگ اپنے اپنے دروازوں کو بند کر رہے ہوں تا کہ راہ کے فتنہ وفساد سے محفوظ ہوجائیں، تو وہ اپنا دروازہ کھول دے اور دکھلا دے کہ بند کر کے چھپ رہنے میں فضیلت نہیں ہے، بلکہ کھول کر باہر نکلنے، میں اور اگر باہر امن نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دروزاہ کھولنے کا اصلی وقت یہی ہے، نہ کہ بند کرنے کا، مقام عزیمت ورخصت کا یہی وہ فرق ہے جو ایک صاحب دل نے خانقاہ کے گوشۂ عزلت سے نکل کر شیخ شیراز کو بتلایا تھا:

گفت آں گلیم خویش بدر می برد زموج
دویں سعی می کند کہ بر آرد غریق را

تو اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ سنت الٰہی اپنی عادت جاریہ کے مطابق قیامِ حق ورفعِ باطل کے لیے سرگرم انبعاث وظہور ہوتی ہے، اور توفیق الٰہی اپنے کسی اصلح وامثل بندے کے قلب کا عزیمت دعوت کے لیے انشراح کردیتی ہے اور اس کے قدم طریق کو منہاج نبوت پر ثابت ومستقیم فرمادیتی ہے، وہ اپنے عہد کے تمام اصحابِ علم وفضیلت اور اربابِ صوامع ومدارس کو تنگنائے رخصت وضعف میں پیچھے چھوڑ کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے۔ فضائے علو ورفعت اس کو اپنی طرف کھینچتی اور سمائے کمال وکرامت اپنی ساری بلندیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے لیے دوڑتا ہے، گویا آسمان اس کے لیے اتر آتا ہے اور زمین اس کو خود بخود اچھالنے لگتی ہے، اس کی ہمت رفعت طلب اور اس کا حوصلہ متصاعد ومتعارج کسی بلندی پر بھی نہیں رکتا، اور اونچی سے اونچی بلندی کو بھی حضیضِ تسفل وتنزل سمجھتا ہے، مقامِ عزیمت دعوت کی جس بلندی تک بڑے بڑے کارفرمایان عہد کی نظریں بھی نہیں اٹھ سکتی تھیں اور ضعفائے زمان و بیچارگان رخصت کے وہم وگمان کو بھی اس تک بار نہ تھا، اس کا شہباز ہمت، اور سیمرغ عزم اس کی چوٹیوں پر بھی جا کر دم نہیں لیتا اور پیوستہ سر گرم بال افشانی وہمواره صفیر زنانِ بلند پروازی رہتا ہے، ولسان حالہ ینشد بھذا البیت!

بال بکشا وصفیر از شجرِ طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیرِ قفسی!

یہ جو تم ہر عہد ظہورِ اصلاح ودعوت میں دیکھتے ہو کہ ایک طرف تو ہزاروں علمائے ملت اور اربابِ زہد واطاعت موجود ہوتے ہیں، درس وتعلیم علوم، ہنگامۂ مجالس ومواعظ، غلغلۂ اذکار واشغالِ صوامع وزوایا، اور زمزمہ وطنین تسبیح وتہلیل مساجد ومعابد میں بظاہر کسی طرح

کی کمی نظر نہیں آتی، خانقاہوں میں مجاہدات وریاضات کے حلقے قائم اور صحن مساجد میں تلاوتِ قرآن ووظائف واوراد کی صدائیں سرگرم ہوتی ہیں اور:

اما الخیام فانها کخیامهم!

کا پورا پورا عالم نظر آتا ہے، لیکن ساتھ ہی دوسری طرف:

واری نساء الحی غیر نسائها

کا یہ حال ہوتا ہے کہ ظلم وطغیان کا طوفان ہر چہار طرف سے محیط، شر وفساد کا ایک عالمِ رستخیز برپا، ظلمتِ بطلان وفتن ہر طرف چھائی ہوئی، نورِ حق وصداقت مستور ومحجوب، بدعات ومحدثات کی گرم بازاری، منکرات وسیئات کی مقبولیت وطلب کا دور دورہ، اہلِ حق وصدق مظلوم ومقہور، خدا کی زمین پر اس کے کلمۂ حق وعدل کا کہنا بمنزلہ جرم، اور ظلم وعدوان کے لیے اجر وبخشش، اعمال وطاعات کی حقیقت بکلّی مضمحل اور پژمردہ اور روحِ صلاح وخیر سے تمام اجسام وقوالب خالی! یہ سب کچھ علانیہ سورج کی روشنی میں ہوتا ہے، اور مدرسوں میں شور مچانے والے اندھے نہیں ہوجاتے اور نہ خانقاہوں میں چھپنے والے بہرے ہوتے ہیں، سب کی سر کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں اور اوپر کے کان کھلے، لیکن بحکم فانها لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور دل کی بصیرت اس طرح اندھی اور عبرت کے کان اس طرح بہرے ہوجاتے ہیں کہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں مگر ان کے لیے دیکھا ہوا ان دیکھا اور سنا ہوا ان سنا ہوجاتا ہے، دیکھنے پر بھی کسی کی زبان نہیں کھلتی اور سننے پر بھی کسی کا قدم نہیں اٹھتا۔ نفس کا عشق اور زخارف وتمتعاتِ دنیوی کی شیفتگی اس طرح ان کے جسموں میں حلول کر جاتی ہے کہ ہمت کی روح اور عزم کی قوت کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی، راہِ عمل کا ہر تنکا ان کے لیے پہاڑ ہوجاتا اور جادۂ ابتلاء کا ہر کانٹا تیر وخنجر بن کر ان کو ڈراتا اور سہماتا ہے۔ وہ آنکھیں جن میں غمِ نفس اور ماتمِ دنیا کے لیے آنسوؤں کے دریا بند ہوتے ہیں، حق کی غمگینی اور امت کے ماتم کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی نہیں رکھتیں، اور جن دلوں میں عشقِ ذات اور محبت اہل وعیال کے لیے ایک عالمِ شورش اور طوفان اضطراب مخفی ہوتا ہے، اس میں اللہ اور اس کے کلمۂ حق کے عشق کے لیے درد کی ایک ٹیس اور غم کی ایک چبھن بھی پیدا نہیں ہوتی، عین اس وقت جب کہ زاہدانِ شب زندہ دار راتوں کو اٹھ اٹھ کر تسبیح ہزار دانہ کو گردش دیتے ہیں، تو لاکھوں بندگانِ الٰہی مظلومیت کی گرد وخاک پر لوٹتے اور تڑپتے ہیں اور کلمۂ حق کی بیکسی و بیچارگی سے الغیاث! الغیاث! اعینونی یا عباد اللہ! اعینونی یا عباد اللہ! کے نالہ وبکا کی صدائیں اٹھتی ہیں، اور جب کہ حلقۂ مدارس ومجامعِ تعلیم میں کتب فقہ کے ابوابِ قضا وولایت کے نکات ودقائق حل ہوتے اور صحائف حدیث کے ابوابِ اعتصام بالسنّت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرح وتفسیر میں مدعیان فضل وکمال اپنا اپنا جوہر علم وتبحر دکھاتے اور معارکِ مباحث ومطالب کو سر کرتے ہیں، اور مجالس ومحافلِ وعظ میں غلغلۂ اعملوا وتذکروا! وقال الله وقال الرسول پیہم بلند ہوتا اور سامعین کے سروں کو جنبش میں اور دلوں کو شورش میں لاتا ہے، تو عین اسی وقت کفر وضلالت اور بدعات ومنکرات کے غلبہ وقہر سے ارض الٰہی کا ایک ایک کونا چیختا اور چلاتا ہے، پرستارانِ حق کی غربت ہر طرف سر پیٹتی اور ماتم کرتی ہے، خدا کی زمین کے گوشے گوشے سے واشریعتا! وادینا! وامصیبتا! واویلا کی فریادیں اٹھ اٹھ کر آسمان تک جاتی ہیں، اور فضائے کائنات کا ایک ایک ذرہ داعی حق کے لیے روتا اور قائم ہدایت کو کھوجتا ہے اور پکارتا ہے:

یا ناعی الاسلام! قم والغه

قد زال عرف و بدا منکر!

لیکن نہ تو عباد وزہاد وقت کو تسبیح ہزار دانہ کی گردش مہلتِ سماعت

دیتی ہے اور نہ ہنگامہ سازانِ مدارس ومجامع کو اساطیر جدل وخلاف ودساتیر قیل وقال کا شور وغوغا فرصتِ بصارت؛ اصل حقیقت سے اس درجہ بعد وہجر طاری ہوجاتا ہے کہ کسی کے وہم وگمان میں بھی احیاے شریعت وتجدید ملت کا خطرہ نہیں گزرتا، اور کوئی نہیں سوچتا کہ یہ سارے کارخانے اور ہنگامے تو اس لیے تھے کہ لتکون کلمة الله هی العلیا، سو جب وہی سرنگوں ہوگیا تو پھر ان اجسادِ بے روح وقشورِ بے مغز کی پرستش کیا سودمند، علم وعمل ہوسکتی ہے! اور جب روحِ امت مضمحل ہوگئی اور حق کی جگہ باطل کی اور سنت کی جگہ بدعت کی حکومت چھا گئی تو پھر یہ تمام باتیں کب مثمر ومنتج ہوسکتی ہیں! بلکہ ان کا شمار تو اب موانع ومہالک راہ میں سے ہوگیا۔

من لم یکن للوصال اهلا
فکل طاعاته ذنوب

غرض کہ اگر چہ دنیا بظاہر علم وفضیلت سے لبریز ہوتی ہے اور بڑے بڑے اصحابِ طنطنہ وشہرت وارباب فخفخہ وعظمت موجود ہوتے ہیں مگر کسی کو اس کی توفیق نہیں ملتی کہ اپنے عہد ودور کی طلبِ دعوت اور سوالِ قیام ہدایت پر مردانہ وار لبیک کہے اور ظلمت کدۂ ضعف وواماندگی سے نکل کر راہِ عزیمت دعوت میں قدم رکھے اور اگر چہ دروازۂ سعادتِ الٰہی باز اور خزائن رحمت ونصرتِ ربانی ہموارہ درصدد بخشش ویغما ہوتے ہیں مگر سینکڑوں ہزاروں علمائے عہد اور اصحاب خوانق وصوامع میں سے کسی کو بھی اس عہد کے احیاء وتجدید اور طائفه، منصورة من یجد لها دینها میں داخل ہونے اور جماعتِ علیا یحبهم ویحبونه، میں معدود ومحشور ہونے کی توفیق نہیں ملتی، تا آنکہ پردۂ ظلمت چاک ہوتا اور یکا یک صبحِ ہدایت وسعادت مشرقِ تجدید وانبعاث سے عالم افروز وجہاں تاب ہوتی ہے تو اس وقت تم دیکھتے ہو کہ کہ جس راہ میں قدم رکھنے سے ایک عالم درماندہ وناچار تھا، اچانک ایک مردِ ہمت اٹھتا ہے اور نہ صرف قدم رکھتا ہے، بلکہ دوڑتا ہوا چلا جاتا ہے، راہ کی وہ مشکلیں اور صعوبتیں جو ضعفاے عہد کے لیے مصیبتوں کا پہاڑ اور ہیبتوں اور دہشتوں کی گھاٹیاں تھیں اور جن کے وہم وتصور سے بیچارگان وقت کی ارواح پر ایسی دہشت وہیبت طاری ہوجاتی تھی کہ انهم یسافون الی الموت وهم ینظرون تو وہ سب اس کے جولانِ قدم کے لیے ایک مشتِ غبار اور ایک تودۂ خس وخاشاک سے زیادہ حکم نہیں رکھتیں، سب دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور وہ بڑھ کر عزیمت دعوت وہدایتِ عامہ کا بابِ مسدود کھول دیتا ہے، اور اس کی زبان ہمت ومقالِ فتوت اس ترانۂ رجز سے زمزمہ ساز بزم عالم ہوتی ہے۔

تابِ یک جلوہ نیا درد، نہ موسیٰ و نہ طور
ایں لم ہست کہ زینگونہ ہزاراں دیدہ ست!

اگر چہ اس عہد میں ہزاروں مدعیان کار موجود ہوں مگر اس فضیلت مخصوص میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوتا، صرف اسی کو اس عہد کی اقلیم ہدایت کی سلطانی وفرمانروائی پہنچتی ہے، اور صرف وہی اپنے زمانے کا کلید بردارِ خزائن برکات وفیضان سماویہ ہوتا ہے، تمام اصحاب طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اسی کے مصباحِ ہدایت سے روشن کریں، اور تمام رہروانِ جادۂ مقصد مجبور ہوتے ہیں کہ اسی کے کاروانِ فضل وقافلۂ کرامت کی آواز درا پر اپنے اپنے قدم اٹھائیں، وهذا منزلة جلیلة ورتبة عظیمة لا تساویها مزیة ولا تعادلها منزلة ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم.

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارو رسن کہاں

(ماخوذ: تذکرہ، ص۱۱۴تا۱۲۱، ابوالکلام آزادؒ)

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

سماجی خدمت، ایک اہم اسلامی فریضہ

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ، پرتاپگڑھ

مذہب اسلام میں سماجی خدمت کی بڑی اہمت ہے اور اس پر بہت زور دیا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ مذہب اسلام کا خلاصہ، لب لباب اور حاصل خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت ہے تو مذہب اسلام کا مکمل تعارف ہو جائے گا- اسلام نے اللہ اور رسول کی اتباع کے ساتھ بندوں کی خدمت، ان کے ساتھ ہمدردی وغمخواری اور ان کی نصرت و اعانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے- ایک شخص کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہو اور اس کی مخلوقات کے ساتھ بھی، تبھی وہ قربت الٰہی اور رضائے الٰہی حاصل کرسکتا ہے اور ولایت کے درجات طے کرسکتا ہے، اس کے بغیر رضائے الٰہی اور محبوبیت خداوندی کا گمان ایک طرح کا دھوکہ اور فریب ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور حیات مبارکہ میں سماجی خدمات کی جھلکیاں عبادت وریاضت کے بعد سب سے زیادہ نمایاں ہیں- اس لئے بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اسلام سماجی خدمات کا سب سے بڑا داعی اور مبلغ ہے کوئی مذہب اس معاملے میں اسلام کی ہمسری اور مقابلہ نہیں کرسکتا-

مذہب اسلام میں سب سے زیادہ کامیاب انسان اسے کہا گیا ہے، جو اپنی دین داری کے ساتھ لوگوں کے لئے زیادہ مفید اور کارآمد بھی ہو، غور کیجئے نماز کتنی اہم عبادت ہے اس کو دین کا ستون بتایا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے- حج کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ جیسے اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کردیتا ہے، اسی طرح حج بھی پچھلے گناہوں کو ختم کردیتا ہے، لیکن بہتر انسان کا مصداق کون شخص ہے؟ اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ جو سب سے زیادہ نماز پڑھنے والا ہو، جو زیادہ روزہ رکھنے والا ہو، جو زیادہ حج کرنے والا ہو بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے: خیر الناس من ینفع الناس. (شعب الایمان للبیھقی حدیث نمبر 7685) گویا انسانی اور سماجی خدمت کرنے کو اسلام نے فوقیت وترجیح دی ہے، وجہ یہ ہے کہ اس کا نفع متعدی ہوتا ہے- قرآن مجید نے اسی لئے اس امت کو خیر امت قرار دیا اور اس کا سبب یہی بتایا کہ یہ امت صرف اپنے نفع کے لئے نہیں بلکہ انسانیت کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ انہیں اچھے کاموں کی طرف بلائے اور برے کاموں سے بچائے، (آل عمران 110) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا بہترین عمل کھانا کھلانا اور سلام کو رواج دینا ہے -(بخاری شریف)

اسلام نے ساری انسانیت کو ایک کنبہ قرار دیا ہے، چنانچہ حبیب خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ انفعھم لعیالہ (المعجم الکبیر حدیث نمبر 10033)- یعنی ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے؛ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ ہے جو اس کے عیال کے لئے زیادہ نافع ہو-

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

.. جو شخص کسی مسلمان کی دنیوی پریشانیوں میں سے کوئی پریشانی دور کرے گا اللہ تعالی اس سے آخرت کی پریشانیاں دور کرے گا اور جو

کسی تنگ دست کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے گا اللہ تعالی اس کے ساتھ دنیا وآخرت میں آسانیاں پیدا کرے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالی دنیا وآخرت میں اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور اللہ بندے کی اس وقت تک مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ (صحیح مسلم حدیث نمبر 2699)

خدمت خلق اور سماجی خدمات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

"انسان کو اس کائنات کا تاجدار بنایا گیا ہے، دنیا کی ہر چیز اس کی خدمت میں مصروف ہے، اللہ تعالی کی دی ہوئی عقل سے اس نے سمندر کی گہرائیوں اور فضا کی بلندیوں کو فتح کیا ہے؛ لیکن وہ جس قدر عظیم ہے، اسی قدر محتاج وضرورت مند بھی ہے، اسے ہر کام میں اپنے جیسے انسانوں کی ضرورت پیش آتی ہے، گیہوں کی دو روٹیاں، چند گز کپڑے اور سر چھپانے کی جگہ بھی، جو اسے میسر آتی ہے، اس میں کتنے ہی لوگوں کی جد وجہد اور کد وکاوش شامل ہوتی ہے؛ اسی لئے ہر مذہب میں خلق خدا کی خدمت کو خاص اہمیت دی گ ء ہے، اسلام میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کی بندگی اور انسان کی مدد کو ایک درجہ میں رکھا گیا ہے؛ اسی لئے اگر کوئی کبر سنی یا بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ پائے تو ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا مقرر کیا گیا ہے: و علی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین (البقرہ 184) بعض گناہوں کا کفارہ ساٹھ روزہ رکھنا ہے اور اگر روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، گویا بھوکے کا پیٹ بھرنا روزہ جیسی عبادت کا ہم درجہ ہے"۔ (ششماہی زبان خلق ص:3/ مرتبہ مولانا مفتی محمد زاہد ناصری القاسمی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی سماجی خدمات کا بہترین نمونہ تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ اس نے اس گراں بار ذمہ داری کی وجہ سے کچھ خوف اور گھبراہٹ محسوس کی، گھر واپس تشریف لائے تو غمخوار وغمگسار شریک حیات ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیفیت سن کر عرض کیا کہ اللہ تعالی ہرگز آپ کو ضائع نہیں کریں گے اور اس موقع پر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ خصوصی صفات کا تذکرہ فرمایا:

ایک یہ کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور رشتوں کا پاس ولحاظ کرتے ہیں دوسرے آپ محتاج ونادار لوگوں کے ساتھ حسن سلوک فرماتے ہیں، تیسرے آپ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، چوتھے آپ مہمانوں کی مہمان نوازی فرماتے ہیں پانچویں کسی پر کوئی مصیبت آجائے اور یہ مصیبت اس کی غلطی کا نتیجہ نہ ہو، تو اس کی مدد فرماتے ہیں- (بخاری کتاب الوحی) غور کیجئے کہ یہ پانچوں اوصاف اور خوبیاں جن کا اوپر تذکرہ ہوا خدمت خلق اور سماجی خدمات کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو شامل ہیں- اس میں حسن سلوک بھی ہے، بدنی اور مالی خدمت اور تعاون واعانت بھی ہے- اگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کی روشنی میں اسلام کا اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کیا جائے تو پوری حیات نبوی اس کا نمونہ نظر آتی ہے اور خدمت خلق اور سماجی خدمات مسلمانوں کا قومی وملی فریضہ معلوم ہوتا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدمت خلق کو اہم انسانی فریضہ قرار دیا اور فرمایا کہ ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کرو (حدیث) صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) مظلوم کی مدد اور حمایت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے ظالم کی مدد کیسے کریں؟ یہ بات ہماری سمجھ سے پرے ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور ان کے شبہ کا ازالہ یوں فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو- گویا مظلوم کی خدمت اس کی نصرت وحمایت جہاں سماجی خدمت ہے وہیں ظالم کو ظلم سے روک دینا بھی انسانی خدمت ہے- بسا اوقات سماجی اور انسانی خدمت کا ثواب نفلی عبادت سے بھی بڑھ جاتا ہے- حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں معتکف تھے کہ ایک شخص پریشان حال اور غم زدہ حضرت کے پاس آکر بیٹھ گیا، آپ نے اس کی پریشانیوں کا سبب معلوم کیا، اس نے کہا مجھ پر فلاں آدمی کا قرض ہے اور اس

روضۂ پاک میں آرام کرنے والے کی عظمت کی قسم میں وہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں ،حضرت ابن عباس نے کہا تو کیا میں اس قرض خواہ سے بات کروں؟اس نے عرض کیا ضرور کیجئے! آپ نے جوتیاں پہنیں اور مسجد سے نکل گئے ،وہ شخص کہنے لگا آپ تو اعتکاف میں ہیں کیا آپ بھول گئے؟ آپ نے فرمایا نہیں بھولا نہیں البتہ میں نے اس روضۂ پاک والے آقا سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت کے لئے قدم اٹھائے اور اس میں کوشش کرے تو اس کی یہ کوشش دس سال کے اعتکاف سے بہتر اور افضل ہے۔(بیھقی)

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے نام سے کون ناواقف ہوگا؟ وہ ہندوستان کے بڑے اور اونچے اولیاء میں سے ایک تھے، جن لوگوں نے برصغیر میں اشاعت اسلام اور فروغ دین کا کام کیا ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام اور کارنامہ آپ ہی کا ہے، ان ہی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک کسان دہلی سے آپ کی خدمت میں اجمیر پہنچا، اس کی زمین پر سلطان التمش کے کارندے قبضہ کرنا چاہتے تھے ،اس نے اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ کے سامنے اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ سلطان دہلی کے آدمی میری زمین سے مجھے محروم کرنا چاہتے ہیں۔اگر آپ سلطان کے پاس جا کر میری سفارش کردیں تو میری زمین مجھ سے نہ چھینی جائے۔حضرت خواجہ اس مظلوم کی فریاد سن کر اجمیر سے دہلی روانہ ہوگئے ،ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو خبر ملی کہ حضرت دہلی تشریف لا رہے ہیں تو انھوں نے اپنے پیر ومرشد کا استقبال کیا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ نے کسی اطلاع کے بغیر سفر کی زحمت کیوں فرمائی ،اگر کوئی ضرورت تھی تو مجھ خادم کو حکم دیا ہوتا،حضرت خواجہ اجمیری رح نے فرمایا:

یہ مصیبت زدہ کسان میرے پاس سلطان کے آدمیوں کے ظلم و جبر کی فریاد لے کر پہنچا تھا، میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مظلوم کی فریاد رسی کے لئے مجھے خود دہلی پہنچ کر سلطان سے اس کی سفارش کرنی چاہئے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تک انسان کسی بندے کی مدد میں لگا رہتا ہے اس وقت تک اللہ تعالی کی نصرت اس کے شامل حال رہتی ہے تو میں خود کیا اس رحمت کا محتاج نہیں ہوں؟(مشائخ چشت:51)

سماجی خدمت اسلام کا اہم اور بنیادی شعبہ ہے، خدمت خلق کو تمام اسلامی تعلیمات کا خلاصہ قرار دیا گیا ہے۔

ہمارے مشائخ، مبلغین وداعیان دین اور اولیاء عظام نے اسلام کی جو زریں خدمات انجام دی ہیں وہ سب خدمت خلق اور سماجی خدمات کے ذریعہ انجام پائیں۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ سماجی خدمت یا خدمت خلق کا لفظ جب ہم استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف مسلمانوں کی خدمت ہی مراد نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد بلا فرق وامتیاز مذہب ومسلک مطلق انسانوں کی خدمت ہے بلکہ پوری خلق اللہ کی خدمت اس میں شامل ہے یعنی اس میں ہر ذی روح شامل ہے گویا انسان تو انسان اللہ کی کسی بھی مخلوق کی خدمت انسان کے لئے پروانۂ نجات بن سکتی ہے اور اسلام میں خدمت کا یہی تصور ہے۔

افسوس کہ جس امت کو انسانیت کے لئے نافع بنا کر بھیجا گیا اور انسانی اور سماجی خدمت جن کی ذمہ داری بتائی گئی اور جس دین میں بہترین انسان ہونے کا معیار اس کی نافعیت کو قرار دیا گیا تھا، آج سماجی خدمت کے کاموں میں وہی امت اور اسی دین کے ماننے والے سب سے پیچھے نظر آرہے ہیں۔ ہم علماء اور دینی خدمت گزاروں کی توجہ بھی اس طرف نسبتا کم ہے، ہندوستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں ضرورت ہے کہ سماجی خدمات پر خوب توجہ دی جائے اور اسی طرح برادران وطن کے درمیان سے نفرت و دوری کے ماحول کو کم کیا جائے اور امن وشانتی کی راہ ہموار کی جائے۔آج دوسری قومیں (خصوصا عیسائی) اس سماجی خدمت کے مشن سے فائدہ اٹھا کر اپنے پرائے سبھوں کو متاثر کر رہی ہیں اور اس بہانے اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہی ہیں۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نرمی کی تعلیم:

ہم میں سے ہر ایک کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ بچہ بڑا ہو کر ایک باادب انسان بنے، دوسروں کے ساتھ نرمی برتنے کا مزاج ہو، اجتماعی زندگی (Social Life) کے لئے یا معاشرے (Socity) میں رہنے کے لئے نرم خوئی اور نرم روی کی عادت انتہائی لازمی ہے، نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے، کہ جس چیز میں نرمی شامل ہوتی ہے تو اس کو خوبصورت بنا دیتی ہے، بچہ جس قدر دوسروں کے ساتھ نرم برتاؤ رکھے گا اسی قدر اس کے بارے میں اساتذہ کی، رشتہ داروں کی رائے اچھی ہوگی، نرمی کی سب سے اچھی قسم وہ ہے جو دوسروں کے بارے میں حقیقی غور وفکر اور سچے احساسات رکھنے سے آتی ہے، اس لیے کہ اگر ہم دوسروں کی ضروریات کو سمجھ کر اور ان کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے ان کی رعایت کریں گے تو اس میں نرم برتاؤ کی تصویر زیادہ نمایاں ہوگی، بہ نسبت اس کے کہ محض معاشرتی آداب کی رعایت میں نرمی کا دکھاوا کیا جائے (برتی جائے)۔ اسی لیے اگر آپ اپنے بچے کو دوسروں کو سمجھنے اور ان کا احترام کرنے پر آمادہ کریں گے تو وہ بڑا ہو کر اچھے اخلاق کا حامل اور دوسروں کے ساتھ نرمی برتنے والا انسان بنے گا، لیکن پھر بھی اس کی یہ ضرورت باقی رہے گی کہ اس کو کوئی وہ الفاظ سکھائے جن سے نرمی کا اظہار ہوتا ہے مثلا ''براہ کرم''، ''براہ مہربانی''، ''معذرت کے ساتھ''، ''معاف کیجئے گا''، ''شکریہ، عنایت، نوازش''، ''کیا میرے لیے اس کی .....اجازت ہے'' وغیرہ؛ البتہ بہترین طریقہ تعلیم بہترین نمونہ ہی ہوسکتا ہے، چنانچہ اگر آپ گھر اور باہر کی روزمرہ کی زندگی میں یہ اور ان جیسے الفاظ کا استعمال کریں گے تو آپ کا بچہ غیر شعوری طور پر آپ کو دیکھ کر اور آپ سے سن کر ان الفاظ کو یاد کر لے گا، اس کے علاوہ بچہ کو اجتماعی زندگی میں لوگوں کے ساتھ سلوک میں ایسے الفاظ استعمال کرنے کی تعلیم بھی دینا چاہیے اور آمادہ بھی کرنا چاہیے، اس طرح وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان الفاظ کے استعمال کا عادی بن جائے گا۔

یہ ملحوظ رہے کہ بچہ عمر کے تیسرے سال میں اس طرح کے الفاظ وتعبیرات کو استعمال کرنے سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا، کیوں کہ اسی مرحلہ میں وہ اپنی شخصیت اور اپنی رائے کے اظہار کی ابتدا کر رہا ہوگا، لیکن ان معاشرتی آداب کی تعلیم کے لئے اسکولی زندگی کا مرحلہ بہت مناسب ہوتا ہے، آپ بچے کی اس طرح مدد کر سکتے ہیں کہ اس کو سکھائیں کہ ''شکریہ اور برائے مہربانی'' وغیرہ ہم دوسروں سے اس لیے کہتے ہیں تا کہ ان الفاظ کے ذریعہ ان لوگوں کا شکریہ ادا کر سکیں اور ان کی قدردانی کا اظہار کر سکیں جو ہمارے لیے فلاں فلاں کام کرتے ہیں، ہمارے لیے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں، اس کو بتائیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ ہم دوسروں سے مدد طلب کرتے ہیں نہ کہ ان کو حکم دیتے ہیں، اور

اس طرح کے الفاظ سے دوسروں کے اندر ہمارے لیے کچھ کرنے اور ہماری مدد کرنے کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اس طرح ان الفاظ کے استعمال سے دونوں فریق کا نفع ہوتا ہے، (ایک کی عزت افزائی ہوتی ہے تو دوسرے کو مدد مل جاتی ہے) لیکن آپ بچے سے یہ توقع نہ رکھیں کہ وہ ہمیشہ اور ہر وقت ان الفاظ وتعبیرات کا استعمال کرے گا، یہ بھی اہم نکتہ ہے جو بچے کو سمجھانا ضروری ہے کہ ان الفاظ کے استعمال کے وقت آواز کا آہنگ اور ادائیگی کا انداز ہمارے موقف، احساسات اور ہماری سوچ کی سچی ترجمانی کرتا ہے، اس لیے ہمارا مقصد صرف ان الفاظ ومرکبات کو استعمال کرنا نہیں بلکہ نطق وآواز کو ان کے مناسب ڈھال کر دوسروں کے تئیں اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کرنا ہے۔

بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے بچے کو نرمی کی تعلیم دیں گے اور اس طرح وہ شریفانہ اخلاق کا حامل ہوگا تو دوسرے بچوں کے سامنے وہ کمزور رہے گا اور دوسرے بچوں کا اس پر غلبہ پالینا آسان ہوگا، ایسے لوگ اپنے بچوں کو سرکش دیکھنا پسند کرتے ہیں کہ وہ بچے نہ کسی بات کا جواب دیں نہ کسی کے سامنے جھکیں، درحقیقت ایسے لوگ نرمی اور کمزوری کے درمیان خلط مبحث کرتے ہیں، چنانچہ نرمی کبھی بھی لوگوں کے سامنے جھکنے اور ذلت اختیار کرنے کا سبب نہیں ہوتی، نرمی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ نرمی برتنے والا دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان سوچے اور حکمت سے کام لے، معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں نرم مزاجی لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے، دوسروں پر اچھے اثرات چھوڑنے کا باعث ہوتی ہے، جبکہ سختی سے مطالبہ کرنے اور نرمی نہ برتنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ نہ جواب دیتے ہیں نہ بات سنتے ہیں، بچہ کی اگر اس طرح تربیت کی گئی تو بلاشبہ وہ عمر اور گزرتے وقت اور تجربات کے ذریعہ ان امور میں مہارت حاصل کرتا جائے گا۔

سچ اور جھوٹ:

انسان میں جس قدر خیال آفرینی کی قدرت ہوتی ہے اسی قدر اس میں ندرت پیدا کرنے اور ایجاد کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، چنانچہ اگر بچہ کی تخیلاتی پرواز اچھی ہے اس کو قصے کہانیوں سے بہت فائدہ ہوتا ہے، پھر وہ دن بھر نئی نئی چیزوں اور نئے نئے کام کرنے میں مشغول رہتا ہے، والدین کے لیے یہ بات فائدہ مند ہوگی کہ وہ بچے کے اندر قوت تخیل پیدا کرنے اور اس میں اضافہ کی کوشش کریں، اس کے لیے قصے کہانی، یا تصویروں یا مختلف قسم کے کھیلوں کا سہارا لیا جاسکتا ہے، اس کے لیے بعض متعین قسم کے سوالات بھی کیے جاسکتے ہیں جو بچے کو سوچنے پر مجبور کریں، اس کو کچھ مشکل نقشے (Puzzels) وغیرہ بھی دیے جاسکتے ہیں جن کو حل کرنے کی وہ کوشش کرے، مثلا اس سے اس طرح کے سوالات کیے جائیں۔

- بیٹا آپ کا کیا خیال اگر ہم ایسا ایسا.....کریں تو کیا ہوگا؟
- آپ کی کیا رائے ہے ہم اس کام کو کس طرح انجام دیں؟
- آپ کیا کہتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟

لیکن ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بچے اپنے خیالات کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتے ہیں، چنانچہ بعض بچے نئے کھیل بناتے ہیں، بعض خیالی کتابوں میں گم ہوجاتے ہیں، بعض کی عقل چیزوں کو بنانے بگاڑنے میں لگتی ہے، چنانچہ وہ کسی بھی چیز کو کھول کر بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں، پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کس طرح بنائی گئی تھی اسے خود بناتے ہیں، بعض بچوں کے اندر عمر کے اسی ابتدائی مرحلہ میں فنی میلانات اور علمی رجحانات بھی ظاہر ہوتے ہیں۔

بعض مرتبہ والدین بچے کے کثرت خیالات اور اس کی شدت کے ساتھ وضاحت کرنے سے بہت پریشان ہوتے ہیں، بالخصوص جب وہ اپنے کیے ہوئے کسی کام یا نہ کیے ہوئے کام کی وجہ جواز پیش

کرنے کے لیے کوئی خیالی کہانی گڑھتا ہے، اس موقع پر والدین کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں بڑا ہوکر یہ جھوٹ کا عادی ہوجائے یا کسی نفسیاتی مرض یا تربیتی مشکل کا شکار ہوجائے۔

بچہ جب کوئی کہانی بنائے تو اس میں غور کرنا چاہیے، مثلاً بچہ سے گھر کی کسی چیز کے ٹوٹنے پر سوال کیا جاتا ہے، یہ کس نے توڑا تو وہ اپنی عدم واقفیت کا اظہار کرتا ہے اور اپنی لاتعلقی ظاہر کرتا ہے، وہ چیز کے توڑنے کی نسبت بلی، گڑیا یا اپنے شیر خوار بھائی بہن کی طرف کرتا ہے، ایسے موقع پر ماں شک میں پڑتی ہے اسے حیرت بھی ہوتی ہے، وہ سوچنے پر مجبور ہوتی ہے کہ کیا وہ بری ہے یا اسی نے توڑا ہے؟ پھر ماں کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچے کی بات کی تصدیق نہیں کر پارہی ہے، اسے یہ بات مغموم کرتی ہے کہ بچے کی ''سچ'' کی عادت نہ ڈالنے کے سبب ایسا ہوا، وہ اسے تربیت کا قصور تصور کرتی ہے، جبکہ حقیقت واقعہ ماں کے تصور سے بہت ہلکی پھلکی ہے، اس واقعہ سے اس کا اظہار نہیں ہوتا کہ بچہ جرائم کی دنیا میں داخل ہورہا ہے، ایسا بھی نہیں کہ ماں سے اس کا تعلق کمزور پڑ رہا ہے، وہ تو ابھی اپنی عمر کے تیسرے چوتھے سال میں ہے، اس مرحلہ میں اس کے لیے یہ بھی مشکل ہے کہ وہ حقیقت وخیال کے درمیان دقیق فرق سمجھ سکے، وہ اس واقعہ کی حقیقت اور اس نے جو کہانی بنائی ان دونوں کے فرق کو بھی واضح طور پر نہیں سمجھتا، وہ آپ ہی سے تو ایسے قصے کہانیاں سنتا ہے جو اس کے اندر خیالات کو جنم دیتی ہے اور اب وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ایک نئی کہانی بنانا چاہتا ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کہانی اس نے بنائی ہو اسے وہ خود سچ سمجھتا ہو اور حقیقت میں جو کچھ ہوا ہے اس سے زیادہ واضح اس کے ذہن میں اس کہانی کی حقیقت ہو جس کو وہ بیان کر رہا ہے۔

مذکورہ بالا وضاحت سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ والدین بچے کی باتوں یعنی اس کے ''جھوٹ اور سچ'' پر توجہ نہ دیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس معاملہ کو بہت سنجیدگی، سمجھ بوجھ اور حکیمانہ تدبیر کے ساتھ حل کرنا چاہیے، اگر آپ بچے کی گڑھی ہوئی کہانی پر غصہ ہوگئے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں، آپ کے غصہ سے کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوگی، بچہ تو اپنی بات پر قائم رہے گا اور اسی کو یاد رکھے گا، بلکہ آپ کے غصہ سے بچے میں بھی غصہ پیدا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ آپ کے سزا دینے کے عمل نے اس میں خوف کی وہ نفسیات پیدا کی ہیں جس کے سبب اس نے خلاف واقعہ بات کی، اسی طرح یہ بھی سودمند نہیں کہ بچے سے کہا جائے کہ اگر صحیح بتادیں تو آپ کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی، اس سے تو وہ اپنی کہانی بدل دے گا، اگرچہ اس نے پہلی بار جھوٹ نہیں بولا لیکن اب سزا سے بچنے کے لئے وہ فی الحقیقت جھوٹ بولے گا۔

اس موقع پر سب سے پہلے والدین کو اس کی فکر کرنا چاہیے کہ وہ بچے کو حقیقت وخیال کے درمیان جو فرق ہے اس کو سمجھائیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محض کہانی بنانے کے سبب والدین کو یہ اجازت نہیں دے دینا چاہیے کہ بچہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے کہانیاں گڑھ گڑھ کر فرار اختیار کرے، اس طرح تو وہ کہانیاں بنانے کو ذمہ داریاں نہ نبھانے کا بہترین ذریعہ سمجھ لے گا، لہذا جب بھی بچہ خلاف واقعہ اور حقیقت کے برعکس بات کرے تو اسے پورے سکون وسنجیدگی کے ساتھ یہ سمجھانا چاہیے کہ زندگی میں ہمیشہ ہم کو اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم حقیقت کو جانیں بالکل اس طرح جس طرح وہ ہے، اس کی توضیح اس کے سامنے اس طرح کیجئے کہ مثلاً وہ آپ سے پوچھے کہ آج دن بھر آپ نے کیا کیا؟ تو ظاہر ہے آپ اس کو حقیقت ہی بتائیں گے نہ کہ کوئی خیالی کہانی بیان کریں گے، انسان کو کوشش کرنا چاہیے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کی تصور پیش کرے، اس موقع پر یہ بھی مفید ہوگا کہ آپ ''بھروسہ'' کا لفظ استعمال کریں اور اس کو یہ بتائیں کہ آپ اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ایک بڑی غلطی ماں باپ سے یہ سرزد ہوتی ہے کہ وہ بچے کی بات سچ ہے کہ نہیں، اس کی تصدیق کے لئے اس سے بار بار سوال

کرتے ہیں، اس طرح باریکی اور تکرار کے ساتھ سوال کرنے، بچے پر یقین نہ کرنے اس کی بات کی تصدیق نہ کرنے سے ہی بچے کو اپنی بات بدلنے اور اپنی کہانی تبدیل کرنے کا حوصلہ ملتا ہے، اور اس میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ لوگ اس پر بھروسہ نہیں کرتے یا یہ کہ وہ لوگوں کے بھروسے کے لائق نہیں ہے، ہونا تو یہ چاہیے کہ والدین بچے کو یہ احساس دلائیں کہ وہ ہمیشہ بچے پر ہی بھروسہ کرتے ہیں اور یہی کافی ہے، والدین کو چاہیے کہ جب ایسے امور مثلاً ''یقین و اعتماد'' کی تشریح کریں تو تین چیزوں کو ملحوظ رکھیں، ایک تو یہ کہ بہت مختصر وقت میں بات مکمل کریں، دوسرے یہ کہ ایسے آسان الفاظ کا استعمال کریں جن کو وہ سمجھے، تیسرے یہ کہ اپنی بات واضح کرنے کے لئے بعض حقیقی مثالیں بھی دیں، ان سب مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اگر بچہ اپنی کہانی پر اصرار کرے تو اس مرتبہ آپ اس کو احتمال پر محمول کرکے چھوڑ دیجئے کہ وہ صحیح ہی کہہ رہا ہوگا۔

البتہ یہ فائدہ مند ہوگا کہ آپ کسی اور وقت پھر سے ان امور کی توضیح کر دیں لیکن کسی شور شرابے اور بغیر کسی پیچیدگی کے، اسی طرح آپ کبھی کبھی کسی ایسے معاملہ کے بارے میں جس کو آپ جانتے ہوں بچے سے پوچھیں، اس طرح آپ جو بات جس طرح پیش آئے ویسے ہی نقل کرنے کا اس کو عادی بنائیں، نہ کہ ایسا ہو کہ جب کوئی مشکل پیش آئے تبھی آپ سوال جواب کریں، اس کے برعکس اگر آپ وقتاً فوقتاً پوچھتے رہیں، بالخصوص اچھے کاموں سے متعلق، تو پھر وہ عادی ہو جائے گا اور سوال جواب سے پریشان نہیں ہوگا، اگر بچہ خلاف حقیقت بات کرے تو آپ اس کو ہلکا سا اشارہ دیجئے کہ وہ حقیقت بیان کرنا شروع کر دے، ہمیشہ صحیح بات بتانے پر آپ اس کی حوصلہ افزائی کیجئے ہلکی پھلکی غلطیوں سے اعراض کیجئے، ممکن ہے وہ غلطیاں محض اس لیے ہوئی ہوں کہ وہ ابھی سیکھنے کے مرحلہ میں ہے، اور اس مرحلہ میں آپ کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچہ میں خود اعتمادی پیدا ہو، اس کی جھجھک دور ہو، اور اس میں صحیح بات نقل کرنے کی عادت پیدا ہو، آپ کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ بعض غلطیوں کو پکڑیں یا آپ اس کو یہ احساس دلائیں کہ وہ آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا، اس طرح بچہ حقیقت وخیال کے درمیان فرق کو اور زیادہ سمجھے گا اور یہ سیکھے گا کہ کس طرح صحیح صورت میں وہ آپ کے سامنے حقیقت کو بیان کرے، یہ صحیح ہے کہ بچے کی تمام غلطیوں سے اعراض وچشم پوشی آپ کے لیے ممکن نہیں مگر آپ اس کی کوشش کیجئے کہ اس طرح خوف کا ماحول نہ پیدا ہو کہ بچہ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے، اس لیے کوشش کیجئے کہ آپ اُسے بغیر کسی سزا کی دھمکی دیے اطمینان سے بات کیجئے، ورنہ پھر وہ قصداً حقیقت کا سامنا کرنے سے کترائے گا اور پھر آپ اس کو انحراف کا عادی بنائیں گے، آپ یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ کیا معاملہ پیش آیا، کہاں پیش آیا اور کیسے پیش آیا، پھر اس سے بچنا کس طرح ممکن ہے، بچہ کو اس پر ابھاریے کہ وہ ہمیشہ حقیقت بیانی کرے اور جب وہ حقیقت بیان کرے تو اس کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار کیجئے تاکہ اس کو پتہ چلے کہ یہ بہت اہم کام ہے جو اس نے کیا ہے۔

ہاں یہ بالکل فطری بات ہے کہ بعض والدین شکوہ کریں کہ یہ طریقہ علاج اور یہ تدبیر کافی وقت لے گی اور اس میں بڑی حد تک صبر سے کام لینا پڑے گا، اس کو برتنے میں ان کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا، ایسے والدین کا یہ خیال ہوتا ہے کہ آسان اور جلدی نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ جب بھی بچہ خطا کرے اس کو سزا دی جائے، اس طرح وہ اس کو جو سکھانا چاہتے ہیں وہ سیکھ لے گا، یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگر ابتدائی عمر میں حکمت وتدبیر کے ساتھ تربیت کی گئی تو آئندہ پھر بہت زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑے گا اور وقت بھی کافی بچے گا، جب بچہ یہ سمجھ لے گا کہ جو کچھ بھی ہو اسے حقیقت بیانی کرنا چاہیے اور اس پر سزا کا خوف بھی نہیں طاری ہوگا تو وہ حقیقت بیانی کرنے کا التزام کرے گا، اور اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا ہنر سیکھے گا، وہ یہ بھی سیکھے گا کہ محبت واعتماد کے رشتے قائم رکھنے کے لئے

سچائی اور شفافیت کا ہونا بہت ضروری ہے، پھر کبھی اگر ایسا ہوا کہ اس سے کوئی بڑی غلطی ہوگئی تو آپ کو بتانے میں اس کو ہچکچاہٹ نہیں ہوگی، لیکن یہ تب ہی ہوگا جب وہ سمجھ لے گا کہ آپ اس کی بات سنیں گے، اس کی مدد کریں گے، اس کی تائید کریں گے نہ کہ اس کو غصہ دکھائیں گے، ملامت کریں گے اور سزا دیں گے۔

بسا اوقات آپ کا بچہ کوئی ایسا کام کر گزرے گا جس سے آپ کو بہت تکلیف ہوگی اور آپ فوراً اس معاملہ کی حقیقت تک پہنچنا چاہیں گے، اس کا تصفیہ کرنا چاہیں گے، مثلاً وہ اسکول سے گھر آئے اور اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ وہ کسی بچے سے لے کر آیا ہے، یا آپ اس کے پاس پیسے دیکھیں جو آپ نے اس کو دیا ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ آپ فوری طور پر بہت پریشان ہوں گے مگر ایسے مواقع پر کیا کرنا چاہیے یہ دراصل قابل غور ہے۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ چھوٹے بچوں میں یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ کیا چیز ان کی ہے اور کیا چیز دوسرے کی ہے اس لیے ایسے مواقع پر صبر وضبط کے ساتھ کام لینا ہی سودمند ہے، چنانچہ آپ بچے کو یہ احساس دلائیں کہ گویا اس نے اس معاملہ میں ٹھیک سے سوچا نہیں، یعنی اس نے یہ پیسے یا وہ چیز لیتے وقت کوئی جرم کرنے کا قصد نہیں کیا بلکہ بس اس نے سنجیدگی سے سوچا نہیں، ہم سب اس طرح کے احساس وداعیہ سے واقف ہیں جو کبھی کبھی دوسروں کی چیز لینے کے لئے پیدا ہوتا ہے، لیکن ہم کبھی نہیں چاہتے کہ کوئی ہماری چیز لینے آئے، اس لیے ہم کو بھی دوسروں کی چیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے، اس کو بتائیے کہ آپ کا احساس ہے کہ اس نے دوسرے کی چیز لے لی ہے، اس عمل پر اس سے بالکل غصہ نہیں ہیں بس آپ اصل حقیقت جاننا چاہتے ہیں، ایسے موقع پر آپ اس کو کھلونے وغیرہ دلانے کی لالچ بالکل نہ دیجئے، ورنہ وہ دوبارہ یہی حرکت محض اس لیے کرے گا کہ آپ اس کو کچھ دلائیں گے، اگر حقیقت سامنے نہ آسکے، تو آپ پھر کسی وقت حقیقت جاننے کی کوشش کیجیے تاکہ بچہ سمجھے کہ آپ نے ابھی یہ موضوع ختم نہیں کیا ہے اور آپ حقیقت جان کر ہی موضوع ختم کریں گے، جب آپ کو لگے کہ اس نے سچ بتا دیا تو آپ اسے سینے سے چمٹا سکتے ہیں اور اس کو بتائیں کہ سچ بولنا بہت اچھی بات ہے، اب آپ وہ چیزیں یا پیسے جن کے ہوں انھیں واپس کر دیں، لیکن یہ چیزیں حکمت وتدبیر کے ساتھ لوٹائیں، ایسا قطعی نہ ہو کہ بات طشت از بام ہو جائے، لوگوں کے سامنے بچے کی فضیحت ہو اور اس کا مذاق بنایا جائے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ معاملہ حتی الامکان آپ کے اور بچے کے درمیان محدود رہے، یاد رکھیے کہ حفاظت علاج سے بہتر ہے، ابھی جبکہ بچے میں اخلاقی حس پیدا نہیں ہوئی ہے تو اس کو ایسی حرکتوں سے بچانے کے لئے چیزوں کو سمیٹ کر اور پیسوں کو حفاظت سے رکھیے تاکہ وہ ہاتھ نہ مار سکے، جو چیز یا جو پیسے آپ نے بچے کے پاس پائے، اگر یہ نہ معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں سے لایا ہے تو فوراً ان چیزوں کو بہت خاموشی سے اسکول پہنچائیے، اس سے بچہ یہ اصول بھی سیکھ لے گا کہ اگر دوسرے کی چیز گھر میں لائے گا تو وہ گھر میں رکھ نہیں سکے گا اور وہ اس کے مالک کو یا اسکول کو واپس کر دی جائے گی۔

بسا اوقات بچہ تصورات میں ہی کچھ لوگوں سے بات کرنا نظر آئے گا، گویا وہ حقیقت میں کسی سے بات کر رہا ہو، آپ اس کی قدر کیجئے اور اس کو یہ نہ سمجھائیے کہ وہ خیالی باتیں کر رہا ہے، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کو بتائیے کہ ایسا لگتا ہے کہ تمہارا یہ دوست تمہارے لیے بہت اہم ہے اور یہ کہ تم جانتے ہو کہ یہ ایک ذہنی تفریح ہے اور بہر حال کھیل ہے، اگر آپ دیکھیں کہ وہ ان خیالی شخصیات میں سے کسی کو ملامت کر رہا ہے کسی غلطی کی بنا پر جس کے سبب وہ ذمہ داری سے فرار اختیار کر رہا ہو، تو آپ اس سے ایسی بات کہیں جس سے اسے یہ احساس ہو کہ آپ اس موضوع سے واقف ہیں، مثلاً یہ کہیں ''اس طرح کی گفتگو سے دوسرے الفاظ میں

تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نے ہی یہ کام کیا ہے، کیا یہ بات نہیں ہے''، آپ کی کوشش یہ ہونا چاہیے کہ آپ نہ ہی ان شخصیات کا انکار کریں اور نہ ہی اس کو گفتگو سے روکیں، بلکہ اس کی بعض خیالی باتوں میں شرکت کریں البتہ آپ حقیقت وخیال کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے درمیان فرق کا خیال رکھیے۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان تخیلاتی شخصیات کے ساتھ ذہنی تفریح کا مرحلہ کم ہوجاتا ہے، اور اسکولی زندگی شروع ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ختم ہوجاتا ہے، یہ تخیلاتی کھیل مختلف بچوں کے پاس مختلف اسلوب کا ہوتا ہے اور مختلف اسباب کی بنا پر ہوتا ہے، چنانچہ بعض بچے اس ذہنی تفریح میں اپنے قصور اور اس احساس کو کم کرنے کے لئے مشغول ہوتے ہیں کہ وہ اپنے والدین کی توقعات پر پورے نہیں اترے، لیکن اس طرح وہ اپنے آپ کو ان خیالی شخصیات سے بہتر اور اچھا تصور کرتے ہیں، اور ان میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ان سے بھی زیادہ قصور وار ہے، جبکہ بعض دیگر بچوں کے یہاں خیالی شخصیات سے کھیل اور گفتگو کا سبب یہ ہوتا ہے کہ بچے کے اندر زندگی کی رمق اور تجربات کم ہوتے ہیں، اس کے پاس چیزیں بھی کم ہوتی ہیں، اس طرح اس کی تصوراتی شخصیات اس کے نزدیک کامیاب وقادر اور آئیڈیل شخصیات ہوتی ہیں، اکثر وبیشتر یہ شخصیات وہی کردار ہوتے ہیں جن کو اس نے کسی قصے یا کہانی میں پڑھا یا سنا ہے، بعض ایسے بچے جن کو کسی کی طرف سے کوئی سزا ملی ہو یا تکلیف پہنچی ہو ان کے خلاف یہی شخصیات ان بچوں کی دوست ہوجاتی ہیں جو ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہیں اور ان کو جو محبت و شفقت درکار ہوتی ہے وہ بھی دیتی ہیں۔

والدین کے لیے یہ مفید ہے کہ وہ ان خیالی شخصیات کی صحیح اور مناسب توضیح کریں، اس کے ذریعہ وہ اپنے بچے کے مزاج کو بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے، اور اس کی مناسب مدد کرسکیں گے، چنانچہ اگر وہ شخصیات بچے کے لئے اطمینان وسکون کا باعث ہیں، اس کے لیے وہ بدل بن رہی ہیں تو والدین بچے کی اس ضرورت کو توجہ کے ساتھ پوری کرسکیں گے، اس فارمولے کے ذریعہ ایسے بچوں کا مزاج بھی سمجھا جاسکتا ہے جو تصوراتی شخصیات تو نہیں رکھتے لیکن وہ جو بھی کھیل کھیلتے ہیں حتی کہ اگر وہ گڑیا گڈے کا کھیل کرتے ہیں تو بھی ان کے کھیل کے مزاج سے ان کے اصل مزاج تک پہنچا جاسکتا ہے، مثلا ہم توجہ دیں کہ بچہ اگر ہمہ وقت اپنے کھلونوں کو مخاطب کرتا رہتا ہے یا جب بھی وہ غصہ میں ہوتا ہے، تکلیف محسوس کرتا ہے یا پریشان ہوتا ہے تو فورا اپنے کھلونوں کی طرف بھاگتا ہے، اور مثلا وہ اپنی گڑیا کو اس انداز سے مخاطب کرتا ہے ''تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو، کیا ایسا نہیں ہے''، یا مثلا وہ گڑیا پر نقد کرتے ہوئے کہتا ہے ''تم نے اپنا ہاتھ نہیں دھویا ہے'' تو اس کے یہ جملے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اہل خانہ بچے کے ساتھ ضرورت سے زائد سختی کررہے ہیں، چنانچہ وہ اسی سلوک کی اتباع اپنے کھیل میں کھلونوں کے ساتھ کررہا ہے، اہل خانہ کو سبق حاصل کرنا چاہیے اور بچے کی سرزنش وتنقید کو کم کردینا چاہیے، ان کو بچے کے کھیل اور کھلونوں کے ساتھ اس کے سلوک سے اس طرح کی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ہمیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس طرح کے خیالی کھیلوں سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہے، البتہ اگر بچہ بالکل اس کا عادی ہوجائے، بغیر اس طرح کے کھیلوں کے وہ رہ نہ پائے بلکہ اس کے اثرات اس کے جسم پر بھی پڑنے لگیں تو پھر کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔

☆☆☆

❑ نقد ونظر

اسلام پر وارد شدہ اعتراضات کے عقلی جوابات اور امام نانوتویؒ

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی
دارالعلوم حیدرآباد
Email: mtalam800@gmail.com

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ) کی پوری زندگی دو نسبتوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہے: تصوف وطریقت جس کی وجہ سے انسان کا قال، حال سے بدل جاتا ہے اور دین کے ہر شعبہ میں ''استقامت'' نصیب ہوتی ہے اور دوسری نسبت اشاعتِ اسلام کے ساتھ دفاعِ اسلام کی ذمہ داری کا احساس، جس کی وجہ سے ''توحید کی امانت'' کو امت تک پہنچانے کا جذبۂ وافر پیدا ہوتا ہے، دارالعلوم دیوبند کا قیام درحقیقت مذکورہ دونوں نسبتوں کو امت تک پہنچانے کا ایک عنوان ہے، اِسی لیے حکمتِ قاسمیہ کے ترجمان حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ (م:۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) نے لکھا ہے کہ ''شاملی کا میدان اور دیوبند کا دارالعلوم ایک ہی سکے کے دو رخ تھے'' حضرت حجۃ الاسلام نے اپنی حیاتِ مستعار کے نو سال والدین کے زیر سایہ گذارے، آٹھ سال تعلیم وتربیت میں، آٹھ سال ذکر وشغل میں اور چوبیس سال ترقیٔ اسلام، دفاعِ اسلام اور ہر فتنے کے سیلاب پر بند لگانے، بدعات وخرافات کا چراغ گل کرنے، اسلام دشمن تحریکیں: عیسائیت، شیعیت، ہندومت اور آریہ سماج کی ہرزہ سرائیوں، موشگافیوں اور بے ہودہ عقلی اعتراضات کے معقولی اور دندان شکن جوابات دینے میں گذارے۔

حضرت حجۃ الاسلام نے نقل کے ساتھ عقل سے اور روایت کے ساتھ درایت سے اور معقولات کے ساتھ محسوسات کے ذریعہ جو دین کا دفاع کیا ہے اور ان کے عقلی اعتراضات کی دھجیاں اڑائی ہیں اور بے جا اتہامات کے قلعہ کو نہ صرف مسمار کیا؛ بلکہ اس کی بنیادوں کے پرخچے اڑادیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان جوابات پر تجزیاتی نگاہ ڈالنے سے پہلے منقولات سے معقولات اور معقولات سے محسوسات تک کی تاریخ اور پس منظر پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جائے؛ تاکہ حضرت حجۃ الاسلام کے تجدیدی طرزِ فکر اور انفرادی طریقۂ استدلال کا اندازہ کیا جاسکے؛ اور ان کے جوابات کی اہمیت، ضرورت، نزاکت، افادیت اور قدر وقیمت معلوم کی جاسکے، اِس کے ساتھ ساتھ اُن اسباب وعناصر کا جاننا بھی ناگزیر ہے جن کی وجہ سے معقولات ومحسوسات میں قلوب کو مسخر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور جن کی وجہ سے عقل کی ہر بات دین کے موافق ہوجاتی ہے جو ایمانی بصیرت اور احسانی کیفیت میں پختگی کا ذریعہ ہے۔

منقولات سے معقولات تک:

ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی اس کی بنیاد بصیرت وتحقیق پر ہونی چاہیے؛ اِسی لیے دین میں عقل وبصیرت اور تدبر کی عظمت وفضیلت بیان کرکے گویا اس کی دعوت دی گئی ہے؛ ایمان واسلام کے اولین مخاطب صحابۂ کرام اپنے صفاءِ ذہن، سلامتیٔ عقل وفطرت، قربِ عہدِ نبوت، فیضانِ صحبتِ نبوی، قلتِ اختلاف اور براہِ راست صاحبِ نبوت سے کلامِ نبوت سننے کی وجہ سے اول مرحلہ ہی میں نورِ بصیرت

کے بلند مقام پر پہنچ جاتے تھے جو سارے دلائل اور بصیرتوں کا نچوڑ تھا، انھیں ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ نقل کے ساتھ مستقلاً عقلی دلائل کی تفتیش میں پڑ کر منقول کو معقول پر منطبق کرنے کی فکر میں پڑیں؛ بلکہ وہ نقل ووحی ہی ان پر عقل ومعرفت کے سارے دروازے کھول دیتی تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ زمانۂ نبوت کے انوار وبرکات کی وجہ سے فتنۂ تشکیک نے اپنا سر بھی نہیں ابھارا تھا کہ صحابۂ کرام منقول کو معقول پر منطبق کرنے کی دفاعی فکر میں مشغول ہوتے۔

زمانۂ نبوت کا بُعد اور فتنۂ تشکیک:

لیکن جب زمانۂ نبوت سے جوں جوں بُعد بڑھتا گیا، شکوک وشبہات کے فتنہ نے عقلِ نارسا کو سامنے رکھ کر، نقل ووحی کے راستوں میں مداخلت شروع کی اور ابتداءً اِس فتنہ نے عقائد اور اصول وکلیاتِ دین کو نشانہ بنایا، اللہ نے اس کی تردید کے لیے اربابِ کلام کا طبقہ پیدا فرمایا، شیخ ابوالحسن اشعری اور شیخ ابومنصور ماتریدی جیسے ائمہ کلام آگے آئے اور انھوں نے وحیٔ الٰہی کی روشنی میں عقائد ومسائل کو عقلی لباس میں دنیا کے سامنے رکھا، جس کی وجہ سے ایمان والوں کے ایمانوں میں مزید بصیرت پیدا ہوئی۔

لیکن فتنۂ تشکیک کی جڑیں بہر حال قائم ہوچکی تھیں جو قائم رہیں اور اب دشمنانِ اسلام نے عقائد واصول چھوڑ کر، اسلام کے عمومی مسائل پر حملہ کیا، اللہ نے اِس موقع پر اربابِ حکمت ومعرفت کو پیدا فرمایا اور امام رازی، غزالی، خطابی اور ابن عربی جیسے دانش ورانِ حکمتِ دین کھڑے ہوئے اور انھوں نے حقائق ومصالح کو عقلی براہین سے مزین کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

لیکن یہ فتنۂ تشکیک اب بھی بالکلیہ ختم نہیں ہوا، اب اس نے فروعی مسائل میں اپنے وہم وشک کا گدلا پانی بہانا شروع کیا جس سے مسائل فقہیہ میں انکار وتشکیک کے فتنہ کا آغاز ہوگیا، اِس موقع پر اربابِ فقہ آگے بڑھے اور انھوں نے فقہی فروعات میں جہاں نقول کے مآخذ پیش کیے وہیں عقلی دلائل کو بھی ان کے دوش بدوش لا کھڑا کیا، ہدایہ اور بدائع الصنائع جیسی لطیف کتابیں وجود میں آئیں، جنھوں نے یہ ثابت کردیا کہ پورے دینِ فطرت میں ''عقلِ کلی'' بطورِ روح کے دوڑی ہوئی ہے۔

عقلی مصالح بحیثیتِ فن:

ان سب کے باوجود ابھی تک عقلی براہین، اسرارِ دین یا حکمتِ اسلام کو مستقل فن کی صورت میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اِس لیے اسرارِ دین، موضوعِ دین تو بن گیا، مگر فن نہیں بنا، آخر کار متأخرین میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کا ظہور ہوا؛ جبکہ ہندوستان کے لیل ونہار بدل رہے تھے، الحاد ودہریت کا سیلاب آیا ہی چاہتا تھا اور عقل پرستی کی گھٹائیں دلوں پر چھا رہی تھیں، حضرت شاہ صاحب نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ اسلام پر شکوک وشبہات کے لیے یہ عقلی اعتراضات فن کی صورت اختیار کرتے جارہے ہیں؛ چناں چہ شاہ صاحب نے اس کے دفعیہ کے لیے، دین کے سلسلے میں عقلی دلائل وبراہین کو ایک فن کی صورت میں مدون فرمایا اور اِس فن میں ایک جلیل القدر کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' تصنیف فرمائی اور عقلی دلائل وبراہین کا ایک عظیم ذخیرہ مہیا فرمایا، اِس کتاب نے حقیقت یہ ہے کہ بندگانِ عقل کی کمر توڑ دی۔

معقولات سے محسوسات تک:

تیرھویں صدی میں جب کہ انگریز ہندوستان میں برسرِ اقتدار آگئے اور اپنے ساتھ ساتھ فلسفۂ جدید اور سائنس کی ترقیات لے کر نمایاں ہوئے، اور سائنس نے مادہ کی ہزارہا سربستہ راز دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیے، جس کی وجہ سے دنیا مخفی اور پنہاں چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی عادی ہوگئی اور دنیا عقلی نظریات اور معقولات سے گذر کر محسوسات ومشاہدات کی گرفت میں آگئی تو قدرتی طور سے پرانے نظریات میں انقلاب رونما ہوا، اب اس کے یہاں کوئی شرعی دعوی اس وقت تک قابلِ سماعت نہیں رہا جب تک کہ وہ معقولات کے ساتھ محسوس شواہد سے محسوس کرکے نہ پیش کیا جائے اور اِس طرح سے اسلامی حصار پر عقلی نظریات کے بجائے حسی مشاہدات سے حملے شروع ہوئے۔

اِس ضرورت کی تکمیل کے لیے حق تعالیٰ کی فیاض قدرت نے شمس الاسلام حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کو اس دور کے طبعیاتی رنگ کے امراض اور جراثیم کے معالجہ کے لیے بطور طبیب اور مصلحِ امت کے نمایاں فرمایا اور آپ نے اپنی تقریر اور تحریر کے ذریعہ ان بندگانِ سائنس ومشاہدات کے دماغوں کو انھیں کے مسلمات سے جھنجھوڑا اور منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جہاں خالص عقلی دلائل کی روشنی میں جوابات دیئے وہیں ان جوابات کو آج کے محسوسات اور حسی شواہد ونظائر سے مدلل فرمایا جو اُس دور کا اہم تقاضا تھا۔(۱)

حضرت نانوتوی کا مشن:

حضرت حجۃ الاسلام نے منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جو جوابات دیئے اور ان کا کامیاب تعاقب کیا، درحقیقت یہ آپ کی زندگی کا اصل مقصد تھا؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جب دینِ اسلام کا تقاضہ ہوتا تھا تو آپ کے فضل وکمال پر جتنے حجابات پڑے رہتے تھے وہ یک بیک اٹھ جاتے تھے پھر شرعی جوابات کی ضرورت ہو یا عقلی: سب حاضر وہ بھی اِس طرح کہ احساسِ فضل وکمال اور ہمہ دانی کے غرور سے تنی ہوئی گردنیں بھی آپ کے سامنے خم ہوجاتی تھیں، تاریخ اس کی شاہد ہے، مختلف ادیان سے مناظرے کے بعد حضرت حجۃ الاسلام نانوتوی کے تئیں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی (م:۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء) کا تأثر پڑھیے۔ اب مجھے مولانا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ حق تعالیٰ نے ان سے جو کام لینا تھا وہ پورا ہو چکا اور وہ یہ تھا کہ تمام مذاہب کے جتھے میں اسلام کی ایک منادی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری ہوجائے۔(۲)

حضرت نانوتوی کی دور رس نگاہیں:

اوپر کے اقتباس سے یہ بات واضح ہوچکی کہ حضرت حجۃ الاسلام کی زندگی کا مشن کیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ تاریخ شاہد ہے کہ ان عقلی اعتراضات کے جوابات سے حضرت حجۃ الاسلام کا مقصد ایسے رجالِ کار پیدا کرنا بھی تھا جو اِس ملک میں اسلام کو درپیش خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کرسکیں، اسلام کے تحفظ وبقاء اور دفاع کا جوش اور ولولہ ان کے دلوں میں ہو اور دفاعِ اسلام کی راہ میں ہر طرح کی جانی ومالی قربانیاں دینے کے لیے تیار ہوں؛ چنانچہ حضرت حجۃ الاسلام کی تحریرات نے آنے والی نسلوں کے لیے کتنی راہیں کھول دیں اور عقلیات کے تعلق سے کتنے کام ہوئے اور ہورہے ہیں، سب اسی تحریکِ قاسمی کی کڑیاں ہیں، حضرت نانوتوی نے ایک چراغ جلایا، جس سے نہ جانے کتنے چراغ جلے، بڑھے اور عالمِ اسلام کو روشن رکھا ورنہ غدر ۱۸۵۷ء نے ہندوستان میں ساری بساط ہی الٹ دی تھی۔(۳)

حضرت نانوتوی کا علمی مقام:

حضرت نانوتویؒ نے منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے جو جوابات دیے ہیں ان میں تحقیقی نکات، تجزیاتی معلومات اور استدلالی لطائف اور مسکت طرزِ استدلال اور عام فہم مثالوں کا جو حسین سنگم ملتا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے، معقولات ومحسوسات کے ذریعہ گفتگو کرنے والوں کی تعداد کم نہیں ہے؛ لیکن ایسے لوگ جن کی معقولیت کا جادو سر چڑھ کر بولے بہت کم ہیں، حضرت حجۃ الاسلام کو اِس میدان میں ''بانی'' کی حیثیت حاصل ہے، یہ ایک یقینی امر ہے کہ عقلیات کے مسلمات کے لیے نقلیات پر گرفت از حد ضروری ہے؛ اِسی لیے حضرت حجۃ الاسلام کا نظریہ تھا کہ عقل کی کوئی بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہونی چاہیے، حضرت حجۃ الاسلام کو نقلیات پر کتنی گرفت تھی، آپ کے جوابات کے بنیادی عناصر کیا تھے، بہتر ہے کہ اِس پس منظر کے لیے چند اقتباسات نقل کردیئے جائیں۔

سفینۂ رحمانی فارسی زبان میں نثر کا نہایت عمدہ شاہ کار ہے، کتاب کے مولف نے حجۃ الاسلام کے تئیں جو کچھ لکھا وہ مبنی برحقیقت ہے، بیشۂ فضل وکمال کے شیر، گلزارِ عشقِ الٰہی کی خوشبو، بستانِ طریقت وشریعت کی شمع، آسمانِ حقیقت ومعرفت کے خورشید، عالم کامل اور جود وسخا میں رشکِ حاتم جناب حضرت مولوی محمد قاسم

صاحب (اللہ ان کی قبر منور فرمائے) قصبۂ نانوتہ کے برگزیدہ علماء وفضلاء میں سے تھے، طرح طرح کے علوم کی منزلیں اور قسم قسم کے فنون کے رموز کے نشیب وفراز انھوں نے اپنی خداداد ہمت واستعداد سے کامل طور پر طَے کیے تھے، انھیں کانِ علوم اور مخزنِ فنون کہنا چاہیے.....(۴)

حدائق الحنفیہ: حضراتِ علماء وفقہاءِ حنفیہ کا اردو زبان میں نہایت مستند ومشہور تذکرہ ہے، مولفِ کتاب نے حجۃ الاسلام کا ذکر یوں کیا ہے:

علامہ عصر، فہامۂ دہر، فاضلِ متبحر، مناظر، مباحث، حسن التقریر، ذہین، معقولات کے گویا پتلے تھے، آپ لڑکپن ہی سے ذہین، طباع، بلند ہمت، تیز، وسیع حوصلہ، جفاکش اور جری تھے، مکتب میں اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ اول رہتے تھے....

آگے لکھتے ہیں:

اور اِس طرح مضامین بیان فرماتے ہیں کہ نہ کسی نے سنے، نہ سمجھے اور عجائب وغرائب تحقیقات ہر فن میں کرتے جس سے تطبیق اختلافات اور تحقیق ہر مسئلہ کی بیخ وبُن تک ہو، ہو جاتی تھی۔(۵)

شیخ العرب والعجم قطب الاقطاب حضرت حاجی امداد اللہ نورہ اللہ مرقدہ (م:۱۳۱۷ھ) جو حضرت حجۃ الاسلام کے پیر ومرشد ہیں ان کا قولِ فیصل پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان عطا فرماتا ہے؛ چناں چہ حضرت شمس تبریز کے واسطے مولانا رومی کو لسان بنایا تھا اور مجھ کو، مولانا قاسم لسان عطا ہوئے ہیں اور جو میرے قلب میں آتا ہے، مولوی صاحب اس کو بیان کر دیتے ہیں۔(۶)

حضرت نانوتوی کی تصانیف میں جا بجا آپ کے محدثانہ ذوق اور رسوخ فی العلم کی جھلکیاں ملتی ہیں، آخر کچھ تو بات تھی کہ تحشیۂ بخاری کی خدمت آپ کے سپرد کی گئی، حضرت حجۃ الاسلام کے تئیں مذکورہ بالا شہادتوں اور ان کی علمی وتحریری خدمات کا اگر تجزیہ کر کے نتیجہ نکالا جائے تو کچھ یوں خلاصہ نکلتا ہے کہ آپ کے علم میں وسعت سے کہیں زیادہ ''عمق'' اور کمیت سے زیادہ ''کیفیت'' ہے، اگر چہ ان کی تصانیف کے صفحات کی تعداد کم ہو؛ لیکن علوم ومعارف کا جو فیضان ہے ان کے لیے صفحات ناکافی ہیں، ان تصانیف کی زبان اگر چہ عربی نہیں ہے؛ لیکن انداز ایسا کہ علماء یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ان کے علوم ومعارف کسبی کم، وہبی زیادہ تھے اور تواضع، کسرِ نفسی اور للّٰہیت وخلوص کے مثال آپ تھے، حضرت حجۃ الاسلام کی وفات پر سرسید (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے جو تعزیتی تحریر لکھی تھی اس کا ایک پیراگراف بطور دلیل کے پڑھیے:

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اِس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبد العزیز سے کچھ کم ہو؛ اِلا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا، درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔(۷)

یہ چند اقتباسات اِس لیے گوارہ کیے گئے؛ تاکہ یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ معقولات ومحسوسات کا فن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر کس وناکس اس میں طبع آزمائی کر سکتا ہے؛ بلکہ عقلیات کے فن کے لیے- سچی بات یہ ہے کہ- جملہ اسلامی علوم وفنون پر مکمل دسترس کا ہونا امرِ ناگزیر ہے ورنہ بجائے عقل کو دین کے تابع کرنے کے، انسان دین کو عقل کے تابع بنا سکتا ہے، جس میں گمراہی کے خطرات یقینی ہیں، حضرت حجۃ الاسلام سے قدرت نے اول الذکر کام لیا جس کی وجہ سے انھیں جملہ علوم وفنون سے نوازا گیا اور عقلی اعتراضات کے جو جوابات امت کے سامنے آئے وہ اِس بات کے غماز ہیں کہ ان کا علم خداداد تھا، حاضر جوابی آپ کی فطرت کا حصہ تھی، علمِ کلام تو جیسے آپ کا خانہ زاد تھا؛ اسی صلاحیت کی وجہ سے حضرت اپنا نقطہ نگاہ مثالوں سے اتنا واضح فرما دیتے تھے کہ اہلِ علم کے علاوہ عوام وخواص بھی جوابات کی اہمیت اور اس کے وزن کو سمجھ جاتے تھے؛ چوں کہ تمثیلات روزمرہ

کی زندگی کے حالات وکوائف سے پیش کی جاتی تھیں؛ اِس لیے ہر شخص کو اسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا تھا۔

مولانا نظام الدین اسیر ادروی لکھتے ہیں:

دشمنانِ اسلام: عیسائی اور آریہ نے جو جارحانہ اندازِ بیان اختیار کر رکھا تھا، ان کا جواب وہی عالم بہتر طور پر دے سکتا تھا جو علمِ کلام سے خوب واقف ہو، خود حضرت نانوتوی نے اِسی حربہ سے کام لے کر ادیانِ باطلہ کے بڑے بڑے مدعیانِ علم وفن کے ایسے پرخچے اڑائے کہ دوبارہ آپ کا سامنا کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی، واقعات اس کے شاہد ہیں۔(۸)

اعتراضات وجوابات کی جھلکیاں:

مذکورہ تمہیدات وتفصیلات کے بعد چند عقلی اعتراضات اور حضرت حجۃ الاسلام کی طرف سے دیے گئے جوابات کا تذکرہ مناسب ہے؛ تاکہ بصیرت کے ساتھ ان جوابات کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکے۔

(۱) گوشت خوری سے متعلق اعتراضات:

(الف) ہندوؤں کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کو بوٹی بوٹی کاٹنا ظلم ہے وہ اسے ''جیوہتیا'' (جان مارنا) کہتے تھے، حضرت حجۃ الاسلام نے اس کے جواب میں ''تحفۂ لحمیہ'' نامی ایک مختصر مگر جامع رسالہ لکھا اور عام فہم زبان میں یہ ثابت کیا کہ اسلامی طریقۂ ذبح ظلم نہیں ہے، اگر جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہوتا تو ساری دنیا میں گوشت خوری عام نہ ہوتی، صرف ایک ہندو قوم کے کہنے سے یہ ظلم نہیں ہوسکتا اور اگر ذبح کر کے گوشت کھانا ظلم ہے تو جانوروں کی کھال کا جوتا پہننا، ان کی ہڈیاں اور دیگر اجزاء کا استعمال کرنا، جانوروں کو باندھ کر رکھنا، ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، سرکشی کرنے پر مارنا، اس سے بڑا ظلم ہے، پھر حضرت حجۃ الاسلام نے عوام کی زبان میں محسوس طریقہ پر سمجھایا:

ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ کسی ادنیٰ سے نوکر کو کچھ میٹھائی یا روٹی وغیرہ عنایت کرے اور فرمائے کہ کھاؤ اور وہ بایں خیال کہ اگر کھاؤں گا تو یہ بادشاہ کی چیز ہے اس کی ہیئت بگڑ جائے گی، ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ ہوکر خراب ہوجائے گی اور پیٹ میں جاکر کچھ کا کچھ بن جائے گا، انکار کردے اور نہ کھائے اور غنیمت سمجھ کر سر وآنکھوں پر نہ دھرے بلکہ الٹا پھیر دے تو اس بادشاہ کو کیا اچھا معلوم ہوگا؟(۹)

(ب) آریوں کا ایک اعتراض جانوروں کی حلت وحرمت کے سلسلہ میں تھا کہ اگر جانور دعا پڑھنے سے حلال ہوجاتے ہیں تو سب جانور حلال ہوسکتے ہیں اور اگر دعا پڑھنے سے حلال نہیں ہوتے تو خود مرا ہوا جانور کیوں حلال نہیں سمجھتے مردہ جانوروں کو بھی کھانا چاہیے؟

حضرت حجۃ الاسلام نے پہلے اعتراض کو انھیں پر پلٹ دیا اور فرمایا: خلاصہ درج ذیل ہے:

مہا بھارت کی فصل سوم میں جو مرقوم ہے کہ جن جانوروں کے قتل کے وقت وید پڑھا جائے تو ان کا گوشت پاک ہے اور وہ انھیں لوگوں میں داخل ہے جس نے حیوانات کو ترک کر دیا اور جن حیوانات کے قتل کے وقت وید نہ پڑھا جائے تو وہ روا نہیں، پنڈت جی بتائیں اگر وید کی وجہ سے یہ وصف ہے تو سب ہی جانور حلال ہوسکتے ہیں اور اگر وید کی وجہ سے یہ وصف نہیں تو مردار کو حلال کیوں نہیں سمجھتے؟

حضرت حجۃ الاسلام نے دوسری شق کا جواب یوں دیا، الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ خلاصہ پڑھیے:

ہماری شریعت میں ذبح کے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ بالذات مؤثر ہے جیسے سورج آئینہ کو روشن کردیتا ہے، اگر آفتاب نہ ہو تو آئینہ روشن نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے سورج مؤثر اور آئینہ متأثر، اسی طرح اللہ کا ذکر بوقتِ ذبح مؤثر ہے اور جانور متأثر ہوتا ہے، اگر مؤثر نہ پایا جائے یا متأثر میں تأثُّر کی صلاحیت نہیں ہے تو جانور حلال نہیں ہوسکتا، مردار جانور حرام ہوتا ہے اور حرام جانوروں میں متأثر ہونے کی صلاحیت نہیں؛ اِس لیے وہ حرام ہی رہتا ہے، دعا پڑھنے سے حلال نہیں ہوسکتا۔(۱۰)

(ج) ایک مرتبہ دیانند سرسوتی نے یہ کہا کہ گوشت کے اعتبار

سے سارے جانور برابر ہیں جیسے گائے کا گوشت حلال ہے ویسے ہی خنزیر کا گوشت بھی حلال ہونا چاہیے اور اس نے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے ایک شعر پڑھا

''ماس ماس برابر جیسی گائے ویسی سور''

اِس کے جواب میں عموماً یہ لکھا جاتا ہے اور خود حضرت حجۃ الاسلام نے تحفۂ لحمیہ میں لکھا بھی ہے کہ ناپاک جانوروں میں ان کی جبلی خصوصیات کا اثر ہوتا ہے، جو لوگ خنزیر کھاتے ہیں ان میں خنزیر ہی جیسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں؛ لیکن حضرت حجۃ الاسلام نے مذکورہ شعر کا برجستہ شعر پڑھ کر جواب دیا اور سب کو لاجواب کر دیا فرمایا:

''عورت عورت برابر جیسی بیوی ویسی مادر''

یعنی اگر یہی فلسفہ ہے تو گھر کی عورتوں میں ماں، بہن اور بیوی کا فرق کیوں ہے جبکہ سب برابر ہیں۔(۱۱)

(۲) کیا استقبال قبلہ، قبلہ کی پرستش ہے؟

آریوں کا مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی بت پرست قوم مسلمان ہیں، کیوں کہ دنیا کے سارے مسلمان خانۂ کعبہ کی پرستش کرتے ہیں اور اسی کے سامنے سجدہ کرتے ہیں؟

حضرت حجۃ الاسلام نے اِس اعتراض کے جواب میں ''قبلہ نما'' نامی پوری کتاب لکھی، مولانا اسیر ادرویؒ نے اس کتاب کے تعلق سے لکھا ہے:

حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری بحث عام کتابی علم کی محدود روشنی میں ممکن ہی نہیں، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے قلب پر فیضانِ علمِ الٰہی کا ترشح ہو رہا ہے اور وہ آنکھیں بند کئے ہوئے سارے حقائق کو دیکھ رہے ہیں، قلم، الفاظ و حروف کے نقوش بنانے میں مصروف ہے، خود حضرت نانوتوی کو بھی اس کا احساس تھا کہ یہ بلند مضامین فہمِ انسانی کی قوتِ گرفت سے کچھ زیادہ ہی بلند ہیں۔(۱۲)

مذکورہ کتاب سے چند جوابات نقل کیے جاتے ہیں:

۱- دنیا جانتی ہے کہ مسلمان کعبہ کو بیت اللہ یعنی خدا کا گھر کہتے ہیں، کعبہ کو خدا نہیں کہتے، جب کوئی کسی کے گھر جاتا ہے تو مکان سے ملنے نہیں جاتا؛ بلکہ مکین سے ملنے جاتا ہے، اسی سے سلام کلام کرتا ہے، بادشاہ کے دربار میں جاتے ہیں تو شاہی محل کو سلام نہیں کرتے، بادشاہ کے سامنے جھکتے ہیں، زمین پر سجدہ ریز ہو جاتے ہیں؛ کیوں کہ بادشاہ ہی کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے، مسلمان بھی کعبہ نہیں، ربِ کعبہ کے سامنے جھکتا ہے، اسی کو سجدہ کرتا ہے اور ہندو تو اپنے بتوں کو خانۂ خدا کبھی نہیں کہتے اور نہ سمجھتے ہیں؛ بلکہ اسی بت کو خدا کہتے ہیں۔

۲- اگر مسلمانوں کی عبادتوں میں کعبہ پرستی ہوتی تو جیسے بت پرستی کے وقت بتوں کا سامنے ہونا ضروری ہے ویسے ہی دیوارِ کعبہ کا سامنے ہونا بھی ضروری ہوتا؛ حال آں کہ ادائے نماز و حج کے لیے دیواروں کا ہونا شرط نہیں ہے۔

۳- اہلِ اسلام کعبہ کو اپنے حق میں مختارِ نفع و ضرر نہیں سمجھتے؛ بلکہ حضرت محمد رسول اللہ کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں، آپ ﷺ کے برابر نہ کوئی انسان ہو سکتا ہے، نہ فرشتہ، نہ عرش اور نہ کرسی، اس کے باوجود مسلمان حضور ﷺ کی پرستش نہیں کرتے، اگر اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا ہوتی تو حضور ﷺ کی ہوتی، جب مسلمانوں نے ان کو بھی عبد ہی مانا معبود نہیں مانا تو خانۂ کعبہ کو اپنا معبود کیسے مان سکتے ہیں جب کہ وہ حضور ﷺ سے افضل بھی نہیں ہے اور بت پرست تو اپنے معبودوں کو مختارِ نفع و ضرر اور عابدوں سے افضل سمجھتے ہیں۔(۱۳)

یہ چند جوابات بطور مثال کے تھے ورنہ حضرت نے استقبالِ قبلہ کے سلسلے میں جو متکلمانہ گفتگو کی ہے اور معبود اور تجلی گاہِ معبود کو سمجھایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، مولانا اسیر ادروی نے لکھا ہے:

اِس جواب میں آپ کے بحرِ علم کی طغیانی و تموج کا مشاہدہ ہوتا ہے، سینکڑوں تمثیلات، مشاہدات و تجربات، حقائقِ زندگی، روزمرہ کے واقعات کے شواہد سے اس کی وضاحت پھر اس کے نتائج، پھر ان سے استدلالات کا ایک طوفان خیز سیلاب ہے جو ۶۰ صفحات تک پھیلتا چلا گیا ہے، اصل بحث کتاب ہی میں دیکھی جا سکتی ہے، اس کی تلخیص اس لیے مشکل ہے کہ ترتیبِ مقدمات اگر کئی صفحات تک چلی گئی ہے تو اس سے نتائج کی تفصیل کے لیے بیسیوں صفحات

ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سمجھا یا نہیں جا سکتا۔(۱۴)

(۳) مُردوں کی تدفین بہتر ہے یا جلانا بہتر ہے؟

آریوں کا ایک اعتراض یہ تھا کہ مسلمان مُردوں کو زمین میں دفن کر کے اس کو ناپاک کرتے ہیں، اِس لیے مُردوں کو جلانا بہتر ہے جیسا کہ ہندو مذہب میں ہے؟

حضرت حجۃ الاسلام نے اِس کے دو جواب دیے:

۱- ہندو مذہب میں مُردوں کو جلایا جاتا ہے، اِس کی وجہ سے تو ہوا خراب ہو جاتی ہے اور اس ہوا سے بیماریاں پھیلتی ہیں، اِس لیے مُردوں کو دفن کرنا بہتر ہے۔

۲- اگر بوجہِ ناپاکی مُردوں کا زمین میں دفن کرنا ممنوع اور بوجہِ بدبو زمین کا بچانا ضروری ہوگا تو پاخانہ، پیشاب سے زمینِ خداوندی کا آلودہ کر دینا کیوں کر جائز ہو جائے گا؟ اِس لیے لازم یوں ہے کہ پنڈت جی اور ان کے مرید پاخانہ پیشاب کو زمین پر نہ گرنے دیا کریں، پاخانہ کو پلے میں باندھ لیا کریں اور پیشاب کو برتنوں میں رکھ لیا کریں۔

آگے لکھتے ہیں:

کوئی پنڈت جی سے پوچھے دفن کرنے سے تو زمین سڑتی ہے اور ناپاک ہوتی ہے، پاخانہ پیشاب سے کون سا عطرِ گلاب ومشک زمین پر برستا ہے، یہاں تو نکلتے ہی دماغ پھٹنے لگتا ہے، زمین ناپاک ہو جاتی ہے، ہوا سڑ جاتی، گھر گھر اور کوچہ کوچہ یہ بلائے عام جاں گزا ہوتی ہے، مردوں میں یہ بات کہاں؟

آگے مثال سے وضاحت کی ہے کہ آدمی مٹی سے پیدا ہوا ہے تو مرنے کے بعد مٹی میں دفن ہونا مقتضائے فطرت ہے، علاوہ بریں والدِ خیر اندیش اگر سفر کو جاتا ہے تو فرزند دلبند کو اس کی مادرِ مہربان کے حوالہ کرتا ہے، اس کی والدہ کی سوکن کو نہیں دیتا، اگر یہ ہے تو پھر مناسب یوں ہے کہ تنِ خاکی، حوالۂ خاک کیا جائے، آتش کو نہ دیا جائے۔(۱۵)

(۴) نیند ناقضِ وضو کیوں ہے؟

ایک عیسائی پادری نے اعتراض کیا تھا کہ نیند سے وضو کیوں ٹوٹ جاتا ہے؟

اِس کا جواب عموماً یہ دیا جاتا ہے کہ نیند کے وقت اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے گمانِ غالب یہ ہے کہ ریح نکل جائے، حضرت حجۃ الاسلام نے یہ مذکورہ جواب لکھ کر، مزید یہ لکھا:

اصل میں یادِ خداوندی موجبِ روشنی وصفائی قلب ہے اور غفلت موجبِ کدورت اصلی، اور ظاہر ہے کہ نیند کے وقت سے زیادہ غفلت متصور نہیں، مگر جب کدورت ہوئی تو اثرِ طہارت جو صفائی باطن تھا، کہاں رہا؟ اِس لیے یوں ہی کہنا پڑے گا کہ طہارت بھی چلتی ہوئی۔

اس کے بعد انبیاء اور عام آدمی کی نیند کا فرق آسان فہم انداز میں سورج گرہن اور چاند گرہن کی مثالوں سے واضح کیا جیسے سورج گرہن اور چاند گرہن: دونوں کو گرہن کہا جاتا ہے؛ مگر حقیقت کا فرق ہے، چاند کو گرہن ہو تو روشنی ختم ہوتی ہے اور سورج کو گرہن ہو تو روشنی ہم سے چھُپ جاتی ہے، اِسی طرح ہماری نیند میں ہوش وحواس ختم ہو جاتے ہیں؛ جبکہ حضرات انبیاءِ کرام کی نیند میں ہوش وحواس چھُپ جاتے ہیں۔(۱۶)

(۵) ایک عورت کے لیے متعدد مرد کیوں نہیں؟

اہلِ اسلام کے نزدیک عورتوں کا تعدُّد ایک مرد کے لیے روا ہے اور مَردوں کا تعدد ایک عورت کے لیے روا نہیں ہے، اِسی طرح جنت میں مردوں کو ایک سے زائد حوریں ملیں گی اور عورتوں کو ایک خاوند کے علاوہ دوسرا خاوند نہیں ملے گا، آریوں نے اِس فرق پر اعتراض کیا تھا، حضرت نے جواب لکھا:

۱- عورت اولاد کے حق میں ایسی ہے جیسے زمین پیداوار کے حق میں یعنی دنیا میں عورت کی حیثیت کھیتی کی ہے اور مرد کی حیثیت کھیت کے مالک کی ہے، ایک مالک مختلف زمینوں میں تخم ریزی کر کے فصل اگاتا ہے، اِسی طرح مرد کئی بیویوں سے استفادہ کر سکتا

ہے، اِس میں عقلاً کوئی دشواری نہیں، اگر ایک عورت چند مردوں میں مشترک ہو تو ہر کسی کو ایک وقت قضائے حاجت کی ضرورت پیش آئے تو اندیشۂ فساد وعناد ہے، اِسی طرح ایک بیوی سے متعدد شوہروں کی مشترکہ اولاد ہو تو اولاد کی تقسیم بذات خود باعثِ فساد ہوگی، اِس سے سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

۲- جنت انعام کی جگہ ہے اور انعام میں راحت کے سامان اور اعزاز واکرام کے اسباب دیے جاتے ہیں، رنج وکلفت کے اسباب نہیں دیے جاتے، مرد کے لیے تو تعددِ ازواج، اعزاز واکرام اور راحت وآرام کا باعث ہوگا اور عورت کو اگر متعدد خاوند دیے جائیں تو یہ نہ اعزاز واکرام ہے نہ باعثِ راحت، اِس کے بعد حضرت نے مرد کو حاکم اور عورت کو محکوم ثابت کر کے عام فہم مثال سے مزید وضاحت کی ہے:

اِس صورت میں اگر کسی عورت کے متعدد خاوند ہوں تو اول تو یہ ایسی صورت ہوگی جیسے فرض کرو تنِ واحد ایک شخص تو رعیت ہو اور بادشاہ اور حاکم کثیر، سب جانتے ہیں کہ یوں نہیں ہوا کرتا، ایک ملکہ وکٹوریہ کے کروڑوں آدمی رعیت ہیں، پر ایک ایک رعیت کے آدمی کے لیے کروڑوں ملکہ نہیں، غرض برابر کے درجہ کے متعدد حاکم نہیں ہو سکتے، دوسرے خاوند متعدد ہوں گے تو یوں کہو حاکم متعدد ہوئے اور حاکم متعدد ہوئے تو جتنے حاکم زیادہ ہوں گے اتنی ہی محکوم میں ذلت زیادہ ہوگی، سو یہ تحقیر اور تذلیل اور توہین عورت کے حق میں اگر جائز ہوتی تو دنیا میں تو شاید کسی مذہب میں اس کی اجازت ہوتی؟ مگر بہشت میں جو جائے عزت وآرام ہے، یہ صورتِ تحقیر ہرگز ممکن الوقوع نہیں۔ (۱۷)

(۶) دنیا میں شراب حرام اور جنت میں حلال ایسا کیوں؟

۱- شراب میں دو باتیں ہوتی ہیں: ایک نشہ، دوسرا سُرور، نشہ بے ہوشی کا نام ہے، کم نشہ ہو تو کم بے ہوشی ہوتی ہے اور زیادہ ہوتا ہے تو زیادہ اور سرور کو ہوش لازم ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ نشہ کسی اور چیز کی خاصیت ہے اور سُرور کسی اور چیز کی تاثیر ہے، اگر شراب سے نشہ کی خاصیت نکال دی جائے اور اس کو سرکہ بنا دیا جائے تو اس کا کھانا پینا جائز ہے؛ کیوں کہ یہی نشہ شراب کی حرمت کا باعث ہے، جنت کی شراب میں یہ وجہِ حرمت موجود نہیں ہوگی؛ بلکہ چھان پچھوڑ کر قدرت کی چھلنی سے اس کو جدا کر دیا جائے گا، اب شراب میں فقط لذت اور سرور ہی رہ جائے گا اور یقیناً ہر عاقل کے نزدیک ایسی شراب حلال ہوگی۔

۲- دنیا میں نشہ کی چیزوں کی ممانعت اس اندیشہ سے تھی کہ نشہ کے وقت احکامِ خداوندی ادا نہیں ہو سکتے، سو یہ اندیشہ زندگانی دنیا تک ہی ہے، بعدِ مرگ، تمام احکام ساقط ہو جاتے ہیں، بہشت میں ہر کوئی فرائض وواجبات وغیرہ سے فارغ البال ہوگا، وہاں اگر شراب جائز ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ (۱۸)

(۷) اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟

آج بھی بہت سے لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے؟ حضرت حجۃ الاسلام نے ما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ ہر بنی آدم کا مطلبِ اصلی اپنے خالق کی اطاعت ہے، حضرت نے اِس پر نفیس گفتگو کی ہے جو اصل کتاب میں دیکھنے لائق ہے، بطور نمونہ کے ایک اقتباس پڑھیے:

زمین سے لے کر آسمان تک جس چیز پر سوائے انسان کے نظر پڑتی ہے وہ انسان کے کارآمد نظر آتی ہے، پر انسان اُن میں سے کسی کے کام کا نظر نہیں آتا، دیکھیے زمین، پانی، ہوا، آگ، چاند، سورج، ستارے اگر نہ ہوں تو ہم کو جینا محال یا دشوار ہو جائے اور ہم نہ ہوں تو اشیاء مذکورہ میں سے کسی کا کچھ نقصان نہیں۔ علی ھذا القیاس درخت، جانور وغیرہ مخلوقات اگر نہ ہوتے تو ہمارا کچھ نہ کچھ حرج ضرور تھا؛ کیوں کہ اور بھی کچھ نہیں تو یہ اشیاء کبھی نہ کبھی کسی مرض ہی کی دوا ہو جاتی ہیں؛ پر ہم کو دیکھیے کہ ہم ان کے حق میں کسی مرض کی دوا بھی نہیں ہیں؛ مگر جب ہم مخلوقات میں سے کسی کے کام کے نہیں تو بالضرور ہم اپنے خالق کے کام کے ہوں گے؛ ورنہ ہماری پیدائش محض

فضول اور بیہودہ ہوجائے، جس سے خالق کی طرف تو بیہودہ کاری کا الزام عائد ہواور ہماری طرف نکمے ہونے کا عیب راجع ہواور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ کوئی عاقل ان کوتسلیم نہیں کرسکتا(۱۹)

(۸) حضرت عیسیٰؑ کی اُلوہیّت کی عقلی مثال او رجواب:

میلہ خداشناسی کے آخری اجلاس ۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء کی سہ پہر کوتقریر کرتے ہوئے ایک یورپین پادری نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ مجمع الجہتین ہیں یعنی انسان کامل بھی ہیں اور معبود کامل بھی، حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت ایسی ہے جیسے لوہے کوآگ میں ڈالیے تو وہ لوہا بھی آگ بن جاتا ہے، حضرت نانوتوی نے اپنی تقریر میں کہا:

آپ کے پادری صاحب خود تثلیث کے عقیدے سے انکار کرگئے، یہ مثل سچ ہے کہ بے وقوف وکیل سچا مقدمہ بھی ہار جاتا ہے، یہاں تو باطل عقیدہ کوصحیح عقیدہ کہہ کر پیش کیا جارہا ہے؛ لیکن اس کو بھی ثابت کرنے کے بجائے خود ہی اپنے عقیدہ کی تردید کرگئے، پادری صاحب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ خداایک ہے، متعدد نہیں، حضرت عیسیٰؑ بندہ ہیں، خدانہیں، آپ نے اپنے دعویٰ کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ لوہا دیکھنے میں ظاہر پرستوں کو ہم رنگِ آتش نظر آتا ہے، پرحقیقت میں لوہا اس وقت بھی لوہا ہی رہتا ہے، آگ نہیں ہوجاتا ہے، فقط پرتو آتش سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آگ سے علیحدہ کرلیجیے تو پھر وہ لوہا اپنی اصل حالت پر آجاتا ہے، اگرواقعی لوہا آگ ہوجاتا تو دونوں حالتوں میں وہ یکساں رہتا۔

یہ اتنی موٹی بات تھی کہ اَن پڑھ اور ناخواندہ عوام؛ بلکہ گنوار بھی سمجھ گئے اور مجمع پرخوشی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی، پادریوں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا، اِس لیے اُن پر خفت وذلت کی جھنجھلاہٹ سوار ہوگئی۔(۲۰)

حضرت حجۃ الاسلام کے جوابات عصرِ حاضر کے تناظر میں:

منکرینِ اسلام کے عقلی اعتراضات کے حملے سے، عقائد واحکامِ اِسلام کی حفاظت ومدافعت کے حوالے سے حضرت حجۃ الاسلام کی جملہ تصنیفات میں یہی وہ ناقابلِ ردعقلی ومشاہداتی دلائل ہیں جن کی ہلکی سی جھلک دکھائی گئی، اور مقالہ میں یہی ممکن ومناسب بھی ہے، ان جوابات کو پڑھنے کے بعد حقیقت یہ ہے کہ کوئی سلیم الطبع اور منصف مزاج اور راہِ حق کا متلاشی انسان اسلام کی صداقت، حقانیت اور اس کے دینِ فطرت ہونے کوتسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا؛ کیوں کہ جوابات وتحقیقات میں طریقۂ استدلال اور اسلوبِ بیان خیالی طرز پرنہیں ہے؛ بلکہ محسوساتی ومشاہداتی اصول کوسامنے رکھ کر عقل اور شریعت کا انطباق دکھایا گیا ہے اور ان جوابات نے دودو چار کی طرح بالکل واضح کردیا کہ پورے دینِ فطرت میں ''عقلِ کلی'' بطور روح کے دوڑی ہوئی ہے، بقول حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحب نوراللہ مرقدہ کے:

ذات وصفاتِ خداوندی، مبدأ ومعاد، توحید ورسالت، عقائد وشرائع، برزخ اور قیامت، سزاوجزا، حشرونشر، وزنِ اعمال، میزانِ عمل، جنت ونار، ملائکہ وجنات، عرش وکرسی، لوح وقلم وغیرہ، ان عقائد اور اُن سے متعلقہ اعمال کا صفاتِ خداوندی سے ربط وعلاقہ، کلیاتِ دین کے ساتھ فرعیات کا ارتباط پھر شرائع وعقائد کی عقلی اور طبعی مصالح، اِس طبیعاتی طرزِ استدلال سے کچھ اِس طرح واشگاف فرمائے کہ یہ سب امورِ فطرت اور طبیعت کا مقتضا محسوس ہونے لگے۔(۲۱)

ضرورت اِس بات کی ہے کہ حضرت حجۃ الاسلام کی تصنیفات کا مطالعہ کیا جائے، اِن تصنیفات میں موجودہ افکارِ اَغیار اور احوالِ زمانہ کے تعلق سے کافی مواد نہ صرف یہ کہ موجود ہے؛ بلکہ ان جوابات واستدلالات میں نئے اصول وکلیات کی وضع وتدوین کی شان اور تشکیل نو بھی ہے، مدارس میں -ہوسکے تو- حضرت حجۃ الاسلام کی تصانیف کو خارجی یا داخلی نصاب کا حصہ بنایا جائے، ان جوابات واستدلالات پر بحث کی جائے، تفصیلی مقالات لکھوائے جائیں اور خصوصاً مسائلِ کلامیہ میں حضرت کی تصنیفات سے

استفادہ کا منہج اور طریقۂ کار کے خدوخال متعین کیے جائیں، یقیناً اِس کے دور رس اور مثبت فوائد وثمرات ظاہر ہوں گے، نئی نسل کو حضرت حجۃ الاسلام کی دفاعی خدمات سے باخبر کرنا ہماری ذمہ داریوں کا حصہ ہونا چاہیے، حکمتِ قاسمیہ کے شارح حضرت حکیم الاسلام کے فکر انگیز اقتباس کو بطور تکملہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسے ''مسک الختام'' کہنا بجا ہے۔

اِس حقیر ناکارہ کو خود بھی بارہا اِس کا تجربہ ہوا کہ اِس قسم کی جس مجلس میں بھی قابل گریجویٹوں سے خطاب ہوا اور مناسبِ موقع حضرت والا کے علوم کی ترجمانی کی نوبت آئی تو بارہا یہی اعتراف واقرار کا منظر دیکھنے میں آیا، اِس سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آج کے دور کے انکار والحاد اور دہریت وزندقہ کا قرارِ واقعی استیصال یا دفاع اگر ممکن ہے تو حکمتِ قاسمیہ کی علمی روشنی سے ممکن ہے، جو آج کے فلسفہ وسائنس کے مسلمات اور نئے نئے انکشافات ہی کے اصول سامنے لاکر اسلام کی صداقت کا لوہا منواسکتی ہے اور جس میں حقیقی طور پر اِتمامِ حجت کی شان موجود ہے۔(۲۲)

حوالہ جات:

(۱) حکمتِ قاسمیہ بحذف واضافۃ قاری محمد طیب صاحبؒ، ص:۲۴-۱، شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم دیوبند

(۲) حضرت نانوتوی اور خدماتِ ختمِ نبوت، مولانا محمد سیف الرحمٰن قاسم، ناشر: جامعۃ الطیبات للبنات الصالحات، گوجرانوالہ، ص:۲۵

(۳) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے، مولانا اسیر ادروی، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، ص:۱۵۹، سن اشاعت:۱۹۹۵ء

(۴) سفینۂ رحمانی، حافظ عبدالرحمٰنؒ، ص:۱۱۹، مطبع نول کشور لکھنؤ، سن اشاعت:۱۸۸۴ء

(۵) حدائق الحنفیہ، مولانا فقیر محمد جہلمی، ص:۴۹۲، مطبع نول کشور لکھنؤ، سن تالیف:۱۸۸۰ء

(۶) قاسم العلوم والخیرات، سید نفیس الحسینی، ص:۵، ناشر: سید احمد شہید اکادیمی لاہور بحوالہ انوار العاشقین، ص:۸۷

(۷) موجِ کوثر، شیخ محمد اکرام، ص:۳۶۷، ادبی دنیا مٹیا محل دہلی (۱۹۹۱ء)

(۸) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے، ص:۱۵۹، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند

(۹) تحفہ لحمیہ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ص: ۸، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند

(۱۰) انتصارالاسلام، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۸۳، تسہیل: مولانا اشتیاق احمدؒ، شعبۂ نشرواشاعت دارالعلوم دیوبند ۱۹۸۸ء

(۱۱) الامام محمد قاسم نانوتوی، حیات، افکار، خدمات، ص:۸ باہتمام: تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی ۲۰۰۵ء

(۱۲) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۴۰۵

(۱۳) اختصار: قبلہ نما، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۲۴۶، تسہیل: مولانا اشتیاق احمدؒ، مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۲۰۱۳ء

(۱۴) مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۴۰۴، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند

(۱۵) انتصارالاسلام، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۱۰۱، تسہیل: مولانا اشتیاق احمدؒ، مکتبہ دارالعلوم دیوبند ۱۹۸۸ء

(۱۶) حضرت نانوتوی اور خدماتِ ختمِ نبوت ص:۹۲، ناشر: جامعۃ الطیبات للبنات الصالحات، گوجرانوالہ

(۱۷) انتصارالاسلام ص:۳۷، مکتبہ دارالعلوم دیوبند

(۱۸) انتصارالاسلام ص:۹۳، ۹۴

(۱۹) حجۃ الاسلام، مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۳۳، مجلس معارف القرآن دارالعلوم دیوبند (۱۹۶۷ء)

(۲۰) ماخوذ از: مولانا محمد قاسم نانوتوی- حیات اور کارنامے ص:۱۹۶، شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند

(۲۱) حکمت قاسمیہ ص:۱۹

(۲۲) حکمت قاسمیہ ص:۲۹

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۲۳)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

معیار مدح و ذم:

جس وقت حضرت مولاناؒ کو معیار مدح وذم نے چونکایا تب تک حالت یہاں تک نہ پہونچی تھی جو آج کی منظر نامہ پر ظاہر ہے، اب تو مذہبی حلقوں میں بھی وہی معیار تعریف وتنقید ہے جو کبھی مادی وسیاسی حلقہ میں ہوا کرتا تھا محض شخصیت پرستی، خاندان پرستی، اقربا پروری اور مادی معیاری مدح وذم کا معیار بن چکا ہے، اسلام کی منفعت اور اسلام کا نقصان ملی نقصان اور ملی مفاد کس کے پیش نظر؟ بس ہم اور ہماری بات اور ہمارے فائدہ کا زمانہ ہے، جس کو ایک ادنی حس رکھنے والا بھی محسوس کر رہا ہے، جس کے باعث نقصانات میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور لوگ اب توصیح وغلط کی تمیز بھی اس معیار کے سبب نہیں کر پارہے ہیں، مولانا نے یہ اہم سطریں ایک انتہائی حساس مسئلہ میں ملت کے قائدین کے کردار کو پیش نظر رکھ کر لکھیں:۔

''مصنف کے دردمند دل کو دیکھ کر اور بھی زیادہ صدمہ ہوا کہ بہت سے خالص دینی حلقوں میں بھی مدح وذم اور تعریف وتنقید کا معیار کسی شخص کی اسلامیت اور غیر اسلامیت اور اسلام ومسلمانوں کا سود وزیاں نہیں رہا، بلکہ خالص دنیاوی کارنامے، مادی فتوحات (اور افسوس وحیرت ہے کہ یہاں اس کا بھی وجود نہیں) سیاسی پروپیگنڈہ، اخبار نویسیوں اور اہل سیاست کا خراج تحسین، ماتمی جلوس اور جنازہ کی دھوم دھام اور اس طرح کی سطحی اور ظاہری شکلیں رہ گئی ہیں، اس سے مصنف کو یہ انکشاف آمیز احساس ہوا کہ دینی حمیت اور اسلامی غیرت میں جو اس طبقہ کا سب سے بڑا سرمایۂ افتخار تھا تیزی کے ساتھ انحطاط آرہا ہے، اور یہ وہ نقصان ہے، جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں، یہی احساسات ومشاہدات ہیں جنھوں نے ان مضامین وتقاریر کو ایک مجموعے میں شائع کرنے کی تحریک کی جن کے متعلق خود مصنف کو احساس ہے کہ اس کا اس وقت شائع ہونا بہت سی طبیعتوں پر گراں گذرے گا، لیکن مصنف اس کی ضرورت سمجھتا ہے، اور اس کو دین کی ایک اہم خدمت اور اپنی سعادت یقین کرتا ہے۔

نوارا تلخ تر می زن چوں ذوق نغمہ کم یابی
حدیرا تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی''

(عالم عربی کا المیہ ص ۲۳-۲۴)

علماء کی سطحیت:

مولاناؒ اس مقام پر تھے جہاں سے وہ ایسی باتیں بڑی آسانی کے ساتھ اور بہت واضح انداز میں کہہ دیا کرتے تھے، یہاں جو اقتباس نقل کرنا ہے وہ تو خیر ایک خاص پس منظر میں لکھا گیا، لیکن آج اس کی معنویت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کا حرف حرف شب وروز کے مشاہدات میں جھلکتا نظر آتا ہے، اس ہندوستان میں ایسے بہت حاضر باش حضرات ہیں جو محض شوق سیادت میں سیاست کے گلیاروں کا چکر کاٹتے ہیں، نہ انھیں ملی مفادات کا ادراک ہوتا ہے اور نہ ملت کے مستقبل کی فکر اور نہ ہی وہ حالات کے صحیح تجزیہ پر قادر ہیں لیکن بقول حضرت مولاناؒ ''سطحی قسم کی سیاسی دلچسپیاں (بلیغ

تعبیر) ملت کی زوال پذیری کا ایک بڑا سبب ہیں۔

عالم عربی کے ابھی تازہ المیہ میں بھی اس طرح کی سطحی دلچسپیوں کے باعث انتہائی تکلیف دہ صورتیں سامنے آئیں جنھوں اندھیرے کو اندھیرا کہنے سے انکار کر دیا، حقائق کو اس طرح ٹھکرایا جیسے نابینا اجالے سے انکار کرے، کیا معنی خیز تبصرہ کیا ہے حضرت مولاناؒ نے:

''ہمارے ملک کے بہت سے علماء کی سطحی قسم کی سیاسی دلچسپیاں ترکی کے پچھلے دور کے علماء کی طرح اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ان کو فکر ومطالعہ اور روز مرہ کے واقعات وحقائق کیساتھ اپنے کو ہم آہنگ رکھنے کا موقع نہیں ملتا، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو بہت سے انقلابات کی اس وقت خبر ہوتی ہے، جب وہ اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ جاتے ہیں، اور ان کے فکری نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں، یہی معاملہ ترکی کے انقلاب کے موقع پر پیش آیا کہ ہمارے علماء عرصہ تک (اور شاید بعض اب بھی) کمال اتاترک کو اسلام کا بطل اعظم اور مجدد سمجھتے رہے، اور ان کو اس کے دور رس اقدامات اور ترکی کو مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں کا علم اس وقت ہوا جب وہ اپنی آخری شکل کو پہونچ گئیں اور اس کا خطرہ محسوس ہونے لگا کہ ترکی کا رشتہ عالمگیر اسلامی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماضی اور قدیم ثقافت سے بالکل منقطع ہو جائے گا''۔(عالم عربی کا المیہ ص،۱۶۰۔۱۶۱)

مدرسہ کی تعریف و اہمیت:

مولانا کی نظر میں مدرسہ ایک بہت طاقتور اور مستحکم مرکز کا نام ہے، اس کا زندگی سے بہت طاقتور رشتہ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ زندگی سے اس کے رشتہ کو مضبوط تر کیا جائے اور اس معیار تک پہونچایا جائے جس معیار بلند کا تذکرہ مولاناؒ نے کیا ہے اور جس بلندی پر مولاناؒ کی نگاہ بلند اسے دیکھا کرتی تھی:

''کسی مدرسہ کے لئے اس سے بڑھ کر قابلِ احتجاج اور قابل اعتراض لفظ ہی نہیں ہو سکتے کہ وہ محض ایک دارالآثار یا کسی قدیم عہد کی یادگار ہے، میں اس کو مدرسہ کے حق میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کے مرادف سمجھتا ہوں، میں مدرسہ کو ہر مرکز سے مستحکم، طاقتور، زندگی کی صلاحیت رکھنے والا، اور حرکت ونمو سے لبریز سمجھتا ہوں، اس کا ایک سرا نبوت محمدیؐ سے ملا ہوا ہے، دوسرا سرا اس زندگی سے، وہ نبوت محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے، اور زندگی کے ان کشت زاروں میں ڈالتا ہے، وہ اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کے کھیت سوکھ جائیں اور انسانیت مرجھانے لگے، نہ نبوت محمدیؐ کا دریا پایاب ہونے والا ہے، نہ انسانیت کی پیاس بجھنے والی ہے، نہ نبوت محمدیؐ کے چشمۂ فیض سے بخل اور انکار ہے، نہ انسانیت کے کاسۂ گدائی کی طرف سے استغناء کا اظہار، ادھر سے "انما انا قاسم واللہ یعطی" کی صدائے مکرر ہے تو ادھر سے "ھل من مزید" کی فغان مسلسل، مدرسہ سے بڑھ کر دنیا میں کون سا زندہ متحرک اور مصروف ادارہ ہو سکتا ہے، زندگی کے مسائل بے شمار، زندگی کے تغیرات بے شمار، زندگی کی ضرورتیں بے شمار، زندگی کی غلطیاں بے شمار، زندگی کی لغزشیں بے شمار، زندگی کے فریب بے شمار، زندگی کے رہزن بے شمار، زندگی کی تمنائیں بے شمار، زندگی کے حوصلے بے شمار، مدرسہ نے جب زندگی کی رہنمائی اور دستگیری کا ذمہ لیا تو اسے اب فرصت کہاں؟'' (پاجا سراغ زندگی ص۔۹۰۔۹۱)

مدارس اور احساس کمتری:

مولاناؒ نے ۱۹۵۴ء میں تقریر کرتے ہوئے مدارس کی افسردہ فضا کا شکوہ کیا ہے، اور پوری جرأت کے ساتھ انحطاط کا شکوہ کیا ہے، ان سے بھی پہلے اقبال یہ شکوہ کر چکے ہیں، مولاناؒ نے بھی اس پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے، لیکن افسوس اس پر ہے کہ آج صورت حال اور زیادہ خطرناک ہو چکی ہے، شاید ہم ان نقائص کا پتہ لگانے کے لئے تیار نہیں جو اس احساس کہتری کا باعث ہیں جس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے مولاناؒ نے کیا ہے، (.....بقیہ صفحہ نمبر ۴۴ پر)

❑ انکار حدیث

بعض جدید اصحاب قلم اور حدیث پر اعتراضات

محمد فرید حبیب ندوی

استاد احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام میں حدیث کے بارے میں ایک خاص فصل قائم کی ہے اور اس میں کچھ شکوک و شبہات اور اعتراضات پیش کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیثیں عہد نبوی میں مدون نہ تھیں، فتنۂ وضع حضور پاک علیہ السلام کے زمانے میں ہی شروع ہو چکا تھا، اور صحابہ کرام صرف حافظہ پر اعتماد کرتے تھے، جس کی وجہ سے حدیث میں خوب جھوٹ بولا گیا، موضوعات کی کثرت کا ہی نتیجہ تھا کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کو چھ لاکھ حدیثوں سے انتخاب کر کے مرتب کیا تھا، پھر موصوف نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ پر بھی نقد کیا ہے۔

حدیث کے بارے میں احمد امین کی یہ رائے اور یہ تشکیکی نقطۂ نظر کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، بلکہ ان کا یہ نظریہ مشہور و معروف تھا، چنانچہ ۱۳۵۳ھ میں جب ایک ملحد نے حدیث کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا اور اس کی حجت کے بارے میں شکوک کا اظہار کیا، علماء ازہر نے اس کی مخالفت کی جس کے دباؤ میں حکومت نے وہ رسالہ ضبط کیا تو اس ملحد نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس رائے کی نسبت جن چند بڑے علماء و اداباء کی طرف کی، ان میں احمد امین کا نام بھی تھا، ہمیں امید تھی کہ احمد امین اس بات کی تکذیب کریں گے، مگر افسوس کہ ایسا کرنے کے بجائے انہوں نے اس کی تائید کی۔

۱۳۶۰ھ میں جب جامعہ ازہر میں امام زہری کے بارے میں مباحثہ ہوا تو اس میں احمد امین نے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر سے کہا تھا کہ ''جامعہ ازہر میں مستشرقین کے افکار و نظریات آپ اپنے نام سے شائع کریں تاکہ ازہری طبقہ اس پر آگ بگولا نہ ہو، جیسا کہ میں نے فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام، اور ظہر الاسلام میں کیا ہے''۔

ان تمام باتوں سے حدیث کے بارے میں موصوف کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، انھوں فجر الاسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس کے تعلق سے ہم یہاں گفتگو کریں گے، اور ان کے اعتراضات پر ایک تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

پہلا اعتراض: ''فجر الاسلام'' کے ص ۲۵۸ پر فتنۂ وضع حدیث کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ حدیث: "من كذب على متعمداً فليتبوأ مقعده من النار" سے پتہ چلتا ہے کہ فتنۂ وضع عہد رسول میں ہی شروع ہو چکا تھا، اس طرح کے کسی جھوٹ کے پیش آنے کے بعد ہی حضور پاک علیہ السلام نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی''۔

جواب: تاریخ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ عہد نبوت میں کوئی جھوٹی حدیث سامنے آئی تھی، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کی ایک بڑی تعداد کی طرف سے اس کی تشنیع و مذمت تاریخ میں ضرور درج ہوتی، جہاں تک مذکورہ حدیث کی بات ہے تو اس کا سبب وہ نہیں جو موصوف نے زبردستی نکالنے کی کوشش کی ہے، صحاح ستہ اس بات پر

متفق ہیں کہ یہ ارشاد اس وقت کا ہے جب آپ ﷺ نے صحابہ کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا، بخاری، مسلم اور ترمذی اور دوسرے مؤلفین صحاح ستہ سب نے اس ٹکڑے کو اس حدیث کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں آپ نے صحابہ کو دعوت وتبلیغ کا حکم دیا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو معلوم تھا کہ آگے چل کر کی مختلف قومیں حلقۂ اسلام میں داخل ہوں گی، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہلکے پن سے کام لیں، اس لیے آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا، ان روایات میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں کہ یہ حدیث کسی جھوٹی حدیث کے ردعمل کے طور پر کہی گئی تھی۔

اس حدیث کے سبب پر دلالت کرنے والی دو اور روایات بھی ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ طحاوی نے مشکل الآثار میں حضرت بریدہؓ سے نقل کیا ہے کہ ''مدینہ کے کسی محلّہ میں ایک شخص کچھ لوگوں کے پاس آیا اور کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے درمیان اس اس طرح فیصلہ کروں۔۔اس شخص نے زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کی کسی عورت سے نکاح کا پیغام دیا تھا، مگر انھوں نے انکار کر دیا تھا، اب وہ آیا تو اس عورت کے خاندان میں جا کر ٹھہرا، ان لوگوں نے حضور پاک علیہ السلام کے سے پوچھنے کے لیے ایک شخص کو بھیجا، آپ نے فرمایا کہ اللہ کے اس دشمن نے جھوٹ بولا، پھر آپ نے اپنی طرف سے ایک شخص کو بھیجا اور کہا، اگر تو اس شخص کو زندہ پائے تو قتل کر دینا، اور شاید وہ تجھے زندہ ملے گا ہی نہیں، اور اگر مردہ پائے تو جلا دینا، اس شخص نے جا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ سانپ کے ڈسنے کی وجہ سے وہ مر چکا ہے، تو اس نے اسے جلا دیا۔ اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا، من كذب علي۔

۲۔ طبرانی نے ''اوسط'' میں عبداللہ بن عمرو بن العاص کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور پاک علیہ السلام کے جیسا لباس پہنا، اور مدینہ کے کسی گھر میں پہنچ کر کہا کہ مجھے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا ہے کہ جس گھر میں چاہوں، جاؤں، ان لوگوں نے اس کو ایک گھر میں بٹھایا اور ایک قاصد حضور پاک علیہ السلام کی خدمت میں دوڑا دیا، اور آپ کو اس بات کی اطلاع دی، آپ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ جاؤ، اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر دینا اور پھر جلا دینا، اور اگر مردہ پاؤ تو گویا تمہارا کام پہلے ہی ہو گیا، اور میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوگا، یہ دونوں گئے تو دیکھا کہ وہ شخص پیشاب کرنے نکلا تھا، اسے ایک اژدہے نے ڈس لیا اور وہ مر گیا، آپ دونوں نے اسے جلا دیا اور آپ کی خدمت میں واپس آ کر پورا قصہ سنایا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: من كذب علي متعمداً .....

ان دونوں روایتوں کے بارے میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ ان دونوں روایتوں کا متن منکر ہے، ان کے موضوع ہونے کے قرائن بالکل واضح ہیں، کیونکہ حضور پاک علیہ السلام نے کبھی کسی کو جلانے کا حکم نہیں دیا۔

۲۔ ان کی سند ضعیف ہے، راویوں میں ایسے لوگ ہیں جن کی مرویات قبول نہیں کی جاتیں، اسی وجہ سے سخاوی نے اس قصہ کو موضوع بتایا ہے۔

۳۔ بالفرض اگر انہیں صحیح بھی مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایک دنیوی واقعہ میں جھوٹ بولا گیا تھا، نہ کہ حضور پاک علیہ السلام کی طرف نسبت کر کے کسی دینی مسئلہ میں۔ دنیوی مسئلہ میں، اور وہ بھی صرف ایک بار جھوٹ بولنے کو اس کی دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے کہ دور رسالت ہی میں وضع حدیث کا فتنہ شروع ہو گیا تھا۔

۴۔ دونوں روایتوں میں یہ بات واضح ہے کہ جس شخص نے یہ کام کیا وہ مجہول ہے، اور مدینہ کے باہر کسی بستی کا رہنے والا تھا،

غالب گمان یہ ہے کہ اس نے حضور پاک سے ملاقات کا شرف ہی حاصل نہ کیا ہوگا بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمان ہی نہ ہو (غالباً اسی وجہ سے اس قبیلہ کے لوگوں نے اپنے یہاں کی عورت سے شادی کرنے سے منع کر دیا ہوگا) لہذا وہ صحابی نہیں ہے، اس لئے صحابہ کرام کی راست بازی اور سچائی پر انگلی اٹھانے والوں کے لیے اس میں کوئی دلیل نہیں۔

بہر حال اس حدیث کا سبب چاہے وہ ہو جو کتب ستہ میں مذکور ہے یا وہ ہو جو ان دونوں کمزور روایتوں میں مذکور ہے، اس میں اس کی کوئی دلیل نہیں کہ عہد رسول ﷺ میں وضع حدیث کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

اور اس سے موصوف نے جو نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے وہ سراسر بے بنیاد ہے، اور پھر یہ نتیجہ بھی خود محترم کے غور وفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ غالباً نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کی طرف منسوب ایک خطبہ کی عبارت سے اخذ کیا گیا ہے، دو صفحہ بعد موصوف نے ابن ابی الحدید کے حوالہ سے اس خطبہ کی جو تشریح نقل کی ہے اس سے یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس خطبہ سے واقف تھے، شیعہ نے تو ایسا اس لیے کیا کہ صحابہ کو مجروح قرار دیکر امامت کو حضرت علی کا حق قرار دے سکیں مگر آں موصوف نے ایسا کیوں کیا؟ سوائے اس کے اور کیا مقصود ہو سکتا ہے کہ اس طرح صحابہ کرامؓ کے بارے میں بھی تشکیک پیدا کر دی جائے کیونکہ حدیثوں کے ناقل وہی ہیں اور انہی کے واسطے سے حدیثیں ہم تک پہنچی ہیں۔

دوسرا اعتراض :

ص ۲۵۹ پر لکھا ہے کہ ''موضوع احادیث کی کثرت کی دلیل وہ تفسیری احادیث ہیں جن کے بارے میں امام احمد کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ بھی صحیح نہیں، جب کہ تفسیری احادیث کی تعداد ہزاروں میں ہے، اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ امام بخاری کو جیسا کہ لوگوں نے بیان کیا ہے چھ لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور وہ ان کے زمانہ میں متداول ومعروف تھیں، مگر انھوں نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں صرف سات ہزار حدیثیں درج کی ہیں جبکہ ان میں بھی تقریباً تین ہزار مکرر ہیں۔

جواب : احادیث میں موضوعات کی کثرت سے انکار تو کسی کو بھی نہیں، مگر آں موصوف نے جن دو دلیلوں (تفسیری احادیث اور بخاری کی احادیث) سے اس پر استشہاد کیا ہے وہ قابل غور ہے، ایک تو آں محترم نے تفسیری احادیث سے دلیل پکڑی ہے اور ان کے بارے میں امام احمد کا مذکورہ قول نقل کیا ہے، امام احمد کا جو مرتبہ ہے اسے سامنے رکھ کر ان کے اس قول سے موصوف ان تمام احادیث کی عدم حجیت یا کم از کم ان کے مشکوک ہونے پر دلیل پکڑنا چاہتے ہیں، اس سلسلہ میں دو باتیں عرض ہیں۔

۱۔ احادیث پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص سے یہ مخفی نہیں ہے کہ تفسیری احادیث کی ایک بڑی تعداد صحیح ہے، اسی وجہ سے حدیث کی ہر کتاب میں تفسیری احادیث کا ایک خاص باب ہوتا ہے، اور علماء نے قرآن کی تفسیر کے موقع پر ان احادیث سے استفادہ کی شرط لگائی ہے، امام ابو جعفر طبری، ابو حیان اندلسی اور علامہ سیوطی نے قریب قریب یہی بات لکھی ہے کہ قرآن کے مجہول کی تفسیر، مبہم کی تعیین اور سبب نزول کے بارے میں ان تفسیری احادیث سے استفادہ ناگزیر ہے، کیونکہ یہ حضور پاک علیہ السلام کے ارشادات ہیں جنہیں قرآن کی تبیین وتفسیر کا حکم دیا گیا تھا، اور اس لیے جیسا کہ زرکشی نے کہا ہے قرآن کے دو حصے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جس کی تفسیر نبی اکرم ﷺ اور صحابہ وتابعین سے منقول ہے، اور دوسرا وہ جس کی تفسیر منقول نہیں، اول الذکر حصے کی تفسیر کے وقت منقول روایات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

بہر حال اس سے ثابت ہوا کہ تفسیری احادیث کا ایک حصہ بلکہ

بہت بڑا حصہ صحیح ہے، اگر چہ وہ اس حصے سے کم ہے جو صحیح نہیں، اس لیے جملہ تفسیری روایات کے بارے میں تشکیک آمیز رویہ اختیار کرنا کسی طرح درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۲۔موصوف نے امام احمد کے جس قول کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے:

''تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں، تفسیر، ملاحم اور مغازی''

دوسری روایات کے الفاظ یہ ہیں:

''تین کتابوں کی کوئی اصل نہیں: مغازی ملاحم اور تفسیر''۔

یہاں ہمیں چند باتیں عرض کرنی ہیں:

۱۔اولاً تو اس قول کی صحت مشکوک ہے، اس لیے کہ خود امام احمد نے اپنی مسند میں بہت سی تفسیری روایات نقل کی ہیں، ورنہ اگر ان کی رائے یہی ہوتی تو وہ انہیں کیوں نقل کرتے۔

۲۔دوسری بات یہ کہ صحت کی نفی سے موضوع یا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا، ہوسکتا ہے کہ صحیح نہ ہوں، حسن ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سی احادیث کو امام احمد نے غیر صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ وہ علماء کے یہاں مقبول ہیں۔

۳۔امام احمد نے یہ نہیں کہا کہ تفسیری روایات میں سے کچھ بھی صحیح نہیں، بلکہ یہ کہا کہ تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں، دراصل یہ بات ان تین علوم سے متعلق بعض مخصوص کتابوں کے بارے میں ہے، چنانچہ آپ کے ایک قول میں ''ثلاثۃ کتب'' (تین کتابوں) کی تصریح بھی موجود ہے۔ان تین کتابوں میں سے دو تو مشہور ہیں، ایک کلبی کی اور دوسری مقاتل بن سلیمان کی؛ کلبی کی تفسیر کے بارے میں امام احمد کا ہی قول ہے کہ وہ پوری جھوٹ کا پلندہ ہے۔

۴۔اس سے امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ تفسیری روایات کا صحیح حصہ غیر صحیح کے مقابلے میں بہت کم ہے، یعنی آپ نے سب کی صحت کی نفی نہیں کی ہے بلکہ اکثر کی نفی کی ہے۔زیادہ تر اہل علم نے یہی مطلب قرار دیا ہے۔(اور ایسا بہت ہوتا ہے کہ اس طرح کے جملوں سے اکثر یا بڑا حصہ مراد ہوتا ہے) اتقان میں ہے: ''امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ایسی صحیح احادیث کی ایک کثیر تعداد ہے، اور امام احمد کا یہ قول بھی درست ہے، اس لیے کہ تفسیری روایات کا اکثر حصہ اس سے مراد ہے، نہ کہ سارا ذخیرہ۔

بہر حال جملہ تفسیری روایات کو غیر صحیح یا مشکوک قرار دینے کے لیے امام احمد کے مذکورہ قول سے استدلال کرنا درست نہیں، کیونکہ بخاری ومسلم اور مؤطا وترمذی جیسی امہات کتب میں بہت سی صحیح روایات موجود ہیں۔

شبہ کا دوسرا جزء:

احمد امین صاحب نے اس بات کو کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں لاکھوں احادیث میں سے چھ ہزار ہی کو منتخب کیا ہے، اپنے اس دعوی کی دلیل بنانے کی کوشش کی ہے کہ احادیث کا بڑا حصہ موضوع ہے۔اور امام موصوف نے اپنی کتاب میں جملہ صحیح احادیث کو سمولیا ہے۔

جواب:

یہاں دو باتیں قابل ملاحظہ ہیں:

۱۔ متداول احادیث کی تعداد:

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام بخاری کے زمانے میں جو احادیث متداول تھیں ان کی تعداد چھ یا سات لاکھ تھی، چنانچہ امام احمد کا قول ہے کہ سات لاکھ سے زیادہ احادیث صحیح ہیں اور اس نوجوان یعنی ابوزرعہ کو سات لاکھ یاد ہیں، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس عظیم کثرت کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں پہلی بات تو یاد رکھنے کی یہ ہے کہ محدثین کے یہاں چند اصطلاحات مروج ہیں!

حدیث: اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کے اقوال وافعال ہیں، جب اس کو مطلق بولا جاتا ہے تو موقوف روایات اس کی تعریف سے

خارج ہوتی ہیں۔

خبر: اس میں مرفوع وموقوف اور مقطوع تمام روایات داخل ہوتی ہیں۔

حدیث کی دوسری تعریف: کے مطابق میں مرفوع وموقوف اور مقطوع تمام روایات کو حدیث کہا جاتا ہے، اس معنی میں حدیث خبر کے مرادف ہوگی۔

اثر: اثر وخبر کے الفاظ مترادف ہیں، اس معنی میں مرفوع وموقوف سب کو اثر کہا جاسکتا ہے، البتہ فقہاء خراسان موقوف کو اثر اور مرفوع کو خبر کہتے ہیں۔

اس طرح ایک چیز یہ بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ بسا اوقات ایک ہی حدیث مثلاً دس سندوں سے مروی ہوتی ہے، تو محدثین اسے ایک حدیث شمار کرنے کی بجائے دس حدیثیں شمار کرتے ہیں۔ اور محدثین کو اس کا خاص اہتمام رہتا ہے، محدث ابراہیم بن سعد جوہری فرماتے ہیں:

جو حدیث میرے پاس سو طرق سے نہ آئے، میں اس میں خود کو یتیم سمجھتا ہوں۔

اب سمجھئے کہ احادیث کی تعداد جو سات آٹھ لاکھ بتائی جاتی ہے تو اس میں ایک طرف تو صحابہ وتابعین کے اقوال بھی شامل ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایک ایک حدیث کی کئی کئی سندوں کو بھی کئی حدیثیں شمار کرلیا جاتا ہے۔

شیخ طاہر جزائری مذکورہ اشکال کا یہی جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں:

''امام احمد نے ابوزرعہ کے بارے میں جو فرمایا ہے کہ انہیں سات لاکھ احادیث یاد ہیں، تو جیسا کہ بیہقی نے فرمایا ہے، اس میں صحابہ وتابعین کے اقوال بھی شامل ہیں۔ ولتسئلن یومئذ عن النعیم۔ میں النعیم سے متعلق مفسرین کے دس اقوال منقول ہیں اور ان میں سے ہر قول کو بطریق عموم حدیث کہہ دیا گیا ہے۔

۲۔ بخاری کی صحیح احادیث: احمد امین کے نزدیک امام بخاریؒ کے نزدیک کل صحیح احادیث کی تعداد اتنی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب میں جمع کردی ہے، اور وہ مکررات کو حذف کرکے چار ہزار کے قریب ہے، اور امام بخاری نے اپنے زمانے کی چھ لاکھ متداول احادیث سے انہیں چھانٹ کر جمع کیا ہے۔

یہ احمد امین صاحب کا نرالا دعوی ہے کہ امام بخاری نے جملہ صحیح احادیث کو اپنی کتاب میں جمع کردیا ہے، جبکہ علماء حدیث کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری نے جملہ صحیح احادیث کا استیعاب نہیں کیا ہے، بلکہ صحیح بخاری سے باہر بھی بہت سی احادیث صحیح ہیں، بلکہ ابن صلاح نے خود امام بخاری اور امام مسلم سے اس طرح کی باتیں نقل کی ہیں کہ ہم نے اپنی کتاب میں تمام احادیث صحیحہ کو جمع نہیں کردیا ہے، بلکہ طوالت کے خوف سے بڑا حصہ ہم نے چھوڑ بھی دیا ہے۔

حافظ حازمی نے ''شروط الائمۃ الخمسہ'' میں لکھا ہے: امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ''مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں''۔ دوسری روایت ہے: ''میں نے اپنی کتاب میں صحیح احادیث کی تھوڑی سی تعداد جمع کی ہے، اور جو صحیح احادیث میں نے چھوڑ دی ہیں وہ ان سے زیادہ ہیں، جو میری کتاب میں درج ہیں''۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہوا کہ استاد احمد امین نے احادیث پر جو اعتراضات اٹھائے ہیں، ان کی حیثیت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں، ذرا سی تحقیقی نظر سے ان کا تانا بانا بکھر کر رہ جاتا ہے۔

☆☆☆

قضیۂ فلسطین

اسرائیل کا قیام اور یہودی تصورات: ایک جائزہ

شان محمد ندوی
مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ

صہیونی_ یہودی ہوں یا عیسائی_ اپنے آپ کو خدا کی چہیتی قوم کہتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا ان کو ارض مقدس میں جمع کرے گا، اسکے بعد اپنی اس چہیتی قوم کے ساتھ تصفیہ و مصالحت کریگا اور ان کے ارض مقدس آنے میں جو معاون ثابت ہوگا خدا کے نزدیک وہ بابرکات ہوگا. اس عقیدے کی بنیاد پر انکا ارض مقدس میں جمع ہونا، ریاست اسرائیل کا قائم ہونا اور ان کو اقتدار حاصل ہونا گویا کہ خدا کے وعدے کی تکمیل ہے۔

وہ دلیل کے طور پر یہ عبارت پیش کرتے ہیں: ترجمہ: خدا یوں فرماتا ہے کہ میں بنی اسرائیل کو قوموں کے درمیان سے جہاں جہاں وہ گئے ہیں نکال لاؤں گا اور ہر طرف سے ان کو فراہم کروں گا اور ان کے ملک میں لاؤں گا اور میں ان کو اس ملک میں اسرائیل کے پہاڑوں پر ایک ہی قوم بناؤں گا اور ان سب پر ایک ہی بادشاہ ہوگا اور وہ آگے کو نہ دو قومیں ہوں گے اور نہ دو مملکتوں میں تقسیم کئے جائیں گے. (حزقیال باب 32: 21، 22) یہ ان کی سب سے مضبوط اور صریح دلیل ہے۔

اس سے آگے کی عبارت یہ ہے کہ: ترجمہ: وہاں وہ اپنے بتوں سے اور اپنی نفرت انگیز چیزوں سے اور اپنی خطا کاری سے اپنے آپ کو ناپاک نہ کریں بلکہ میں ان کو ان کے تمام مسکنوں سے جہاں انہوں نے گناہ کیا ہے چھڑاؤں گا اور ان کو پاک کروں گا اور وہ میرے لوگ ہوں گے اور میں ان کا خدا ہوں گا. اور میرا بندہ داؤد ان پر بادشاہ ہوگا اور ان سب کا ایک ہی چرواہا ہوگا اور وہ میرے احکام پر چلیں گے اور میرے آئین کو مان کر ان پر عمل کریں گے. (حزقیال- 37:23، 24)۔

یہاں اس عبارت میں صہیونی داؤد علیہ السلام سے رمزیہ طور پر اسرائیل کی ریاست اور اسکا اقتدار مراد لیتے ہیں. جبکہ کہ یہ سراسر غلط اور افترا پردازی پر مبنی ہے اس لیے کہ یہاں انہوں نے زبردستی کورات اور رات کو دن بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کچھ واضح چیزیں ہیں جن سے اسکی بالکل نفی ہوتی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں داؤد علیہ السلام کا ذکر اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس پیشن گوئی سے مراد آج کی صہیونی ریاست ہو ہی نہیں سکتی. اس لئے کہ حزقیال خود بھی داؤد علیہ السلام کے بعد کے ہیں. اگر کچھ دیر کیلئے ہم مان بھی لیں تو ہم یہ سوال کریں گے کہ: کیا خدا کا یہ مطلق وعدہ ہے یا مشروط اور کیا اسرائیلی ریاست میں ان شروط میں سے کوئی بات بھی پوری پائی جاتی ہے؟ کیا آج تک آسمان سے اترنے والی دو رسالتوں یعنی عیسی علیہ السلام کی رسالت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی انھوں نے تردید نہیں کی؟ جبکہ ان دونوں رسالتوں کا دین ایک ہی ہے. یہاں تک کہ اگر آپ یہ کہیں کہ اس سے مراد تورات کے احکام ہیں جو کہ دراصل اب منسوخ ہیں، تو بھی

آج کے ان صہیونیوں کا تورات کے ان احکام سے کیا واسطہ؟ آج کی یہ دولتِ اسرائیل دنیا کے اندر فحاشی و بدکرداری اور الحاد و خباثت کا ایک بڑا مرکز ہے. اس میں جوا، ہم جنس پرستی، سود اور بڑے بڑے گھناؤنے افعال اس سطح کے ہیں کہ امریکہ بھی پیچھے ہے. اس ریاست کے سب بانی اور موسس بدترین قسم کے ملحد دہریے تھے. اور اشتراکیت پسند مفکر تھے یا پھر گناہوں سے لت پت دہشت گرد ٹولوں کے گرو. تورات کی تمام تر تعلیمات کو پس پشت ڈال کر یہودیوں کو صرف ایک بات یاد ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ خدا کی چہیتی قوم اور ابراہیم علیہ السلام کے وارث ہیں.

دوسری بات: خدا کسی کے ساتھ دائمی وعدہ نہیں کرتا مگر تقوی اور پرہیزگاری اور خدا کی اطاعت وفرمابرداری پر. جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: واذابتلیٰ ابراهيم ربه بكلمات فأتمهن قال انی جاعلك للناس اماما قال ومن ذريتی قال لا ينال عهدی الظالمين (سورہ البقرہ:124)

جہاں تک بنی اسرائیل کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس پر کفر اور ایمان کے حوالے سے بے شمار دور آے اور گئے. اس سلسلے میں ان کا باقی امتوں سے کوئی بڑا امتیاز نہیں سوائے اس کے کہ اگر ان میں آنے والے انبیاء کی کثرت کو دیکھا جائے اور خدا کی جانب سے ان کو بار بار مواقع دے جانے کو ذہن میں رکھا جائے اور خدا کی جانب لوٹ آنے پر آمادہ کئے جانے اور ان پر کی گئی نعمتوں کو مدنظر رکھا جائے تو ان کا کفر دوسری امتوں کی بنسبت زیادہ بڑھا ہوا ہے. بنی اسرائیل کی تاریخ میں قضاۃ کا دور (Period of Judge) اس کی ایک واضح مثال ہے۔

تیسری بات: انہوں نے جو رٹ لگا رکھی ہے کہ خدا کی چہیتی قوم ہیں، تو اس بات کو یہ لوگ اپنے دلوں اور دماغوں سے نکال دیں اس لئے کہ انہوں نے اپنے امتیازی پہلو کو کھو دیا ہے۔ اور رہی بات وارث ہونے کی تو ابراہیم علیہ السلام کی وراثت پر ان کا کوئی حق نہیں، اس لئے کہ اس کی تردید خود انہی کے صحیفے سے ہوتی ہے :حزقیال کہتے ہیں: تب خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد! ملک اسرائیل کے ویرانوں کے باشندے یوں کہتے ہیں کہ ابرھام ایک ہی تھا اور وہ اس ملک (زمین) کا وارث ہوا پر ہم تو بہت سے ہیں. ملک ہم کو میراث میں دیا گیا ہے. اس لئے تو ان سے کہہ دے کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ تم خون پیتے ہو اور اپنے بتوں سے چمٹے ہو اور خونریزی کرتے ہو. کیا تم ملک کے وارث ہوگے؟ تم اپنی تلوار پر تکیہ کرتے ہو. تم مکروہ کام کرتے ہو اور تم میں سے ہر ایک اپنے ہمسایہ کی بیوی کو ناپاک کرتا ہے. کیا تم ملک کے وارث ہوگے؟ (حزقیال: باب 33:23-24)

یہ خطاب دراصل اس نحوست والی ریاست سے ہی ہے حالانکہ یہ پیشین گوئی اس دور کی ہے جب وہ جلاوطنی کے حالت میں تھے جبکہ اس وقت نہ ان کی قوت تھی اور نہ اقتدار رہے آج کے یہ پلید تو جو کچھ اس پیشین گوئی میں کہا جا رہا ہے ان پر پوری طرح صادق آتا ہے.

آخری بات: یہ حقیقت ہے کہ توراتی صحیفوں یہودیوں کو خدا کے ساتھ تصفیہ اور مصالحت کرنے کی دعوت پائی جاتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ تصفیہ اور مصالحت کس انداز کی؟ یہ دراصل توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت ہے. اللہ اور اسکے رسولوں کے ساتھ کفر کی روش چھوڑ دینے کی دعوت ہے. غیر اللہ کی بندگی چھوڑ دینے، خدا کے عائد کردہ فرائض کی پابندی کو اختیار کرنے، ضعیفوں اور یتیموں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے اور مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی دعوت ہے. یہ وہ بات ہے جس کی وضاحت بیشتر توراتی صحیفوں میں ملتی ہے. اور ساتھ ہی اگر وہ اس دعوت سے منحرف ہوتے ہیں اور خدا کے ساتھ اپنے عہد کو توڑتے ہیں تو انکو شدید وعید بھی سنائی جاتی ہے. یہ بنی

اسرائیل کیلئے توراتی صحیفوں کی تعلیم ایک دعوت عام ہے کہ یہ لوگ توبہ کریں اوران کا ہر فرد اور یہ سب بطور جماعت بھی، خواہ وہ کہیں ہوں، خدا کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کریں.

اب ہم ذرا اس بات پر غور کریں کہ آج کے صہیونی کیا اس تعلیم پر عمل پیرا ہیں؟ تو اس کا جواب نفی میں آتا ہے، یہی اصل وجہ ہے کہ خدا ان کو ارض مقدس میں محاکمہ اور سزا کیلئے لوٹائے گا نہ کہ ان کے ساتھ تصفیہ اور مصالحت کیلئے. اس بات کی وضاحت صفنیاہ کا صحیفہ کرتا ہے: اے..... بے حیا قوم جمع ہو! جمع ہو! اس سے پہلے کہ تقدیر الٰہی ظاہر ہو اور وہ دن بآسانی جاتا رہے اور خدا کا قہر شدید تم پر نازل ہو اور اس کے غضب کا دن تم پر آ پہنچے (صفنیاہ:2:1-2)۔

چنانچہ ان لوگوں کے ارض مقدس میں اکٹھا ہونے کے سلسلے میں اسلام کا موقف تو بالکل واضح ہے اور ساتھ ہی ان کا صحیفہ بھی انکی بربادی کا اعلان کر رہا ہے کہ اے بے حیا قوم جمع ہو اس سے پہلے کہ قیامت کا ہولناک دن آئے تم پر قہر خداوندی کا ٹوٹنا ابھی باقی ہے. صہیونی اپنی تباہی کی طرف لوٹ رہے ہیں. انکے محاکمہ کا وقت بالکل قریب آ رہا ہے. قریب ہی (انشاءاللہ) ان کی پکڑ کی جائے گی اور ایک ایک مظلوم کے خون کا حساب لیا جائے گا حتی کہ انکی اینٹ سے اینٹ بجادی جائے گی یہاں تک کہ سر چھپانے کی بھی جگہ میسر نہ ہوگی. ان کا یہ ہوس اور مادیت کا ظاہری عروج ہی انکی تباہی کا سبب بن جائے گا (انشاءاللہ) اور اللہ کی مقدس سرزمین ان مفسدین سے پاک ہوگی. اس لئے کہ اللہ کا وعدہ ہے: ان اللہ لا یحب المفسدین (سورہ قصص:77).

☆☆☆

(صفحہ نمبر ۳۶ کا بقیہ.....)

یا اگر نقائص معلوم ہیں تو ان کی پرواہ نہیں یا پھر ان کو دور کرنے کی جرأت نہیں، بہر حال اس پر غور کرنے اور اس کے ازالہ کی از حد ضرورت ہے تا کہ کسی حد تک صحیح لیکن کچھ تو اس افسردہ فضا میں زندگی کی رمق پیدا ہو اور یہ اپنی افادیت ثابت کر سکیں اور پھر سے دنیا کی امامت کا فریضہ انجام دے سکیں، زندگی کے ہر شعبہ میں زمانہ کی پیروی کے بجائے زمانہ ان کا غلام ہو:۔

''مدارس جو کبھی طاقت اور زندگی کا مرکز تھے، اور جہاں انقلاب آفریں شخصیتیں پیدا ہوتی تھیں، وہ مایوسی، افسردگی، اور احساس کہتری کا شکار ہیں، آج مدارس کی تعداد میں، درس کی کتابوں کی تعداد میں، کتب خانے کے مندرجات کی تعداد میں، وظائف کی تعداد میں، بہت بڑا اضافہ ہے، مگر زندگی کی نبض سست اور قلب کی دھڑکن کمزور ہے، کوئی حساس دردمند کبھی کبھی اس طرف نکل جاتا ہے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور وہ اس بحر کا ہل کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ، کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

لیکن اب تو مدارس کے حق میں کسی طوفان سے آشنا ہونے کی دعا کرتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے، آج مدارس میں طوفان کے آثار نظر آتے ہیں، لیکن یہ باہر کے طوفان کے تھپیڑے اور موجیں ہیں، جو مدارس کے در و دیوار سے ٹکرا رہی ہیں، یہ باہر کے ہنگاموں اور سطحی اور عوامی تحریکات کی صدائے بازگشت ہے، جس میں ہمارے مدارس کے طلبہ کا مقام محض نقال یا آلۂ صوت کا ہے''۔ (پاجا سراغ زندگی ص۔۹۶، ۹۷) (جاری.....)

☆☆☆

❑ تجزیہ

اصلی دہشت گرد کون؟؟

زین العابدین ندوی

ایک مقولہ ہے کہ کمزور اور بے بس کے محاسن میں بھی دنیا کو نقص اور خامی نظر آتی ہے، ایسا ہی معاملہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں نظر آرہا ہے، چہار جانب سے اسلام کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور اس کے ماننے والوں کو دہشت گرد جیسے نا زیبا القاب سے نوازا جارہا ہے، جب کہ اسلام کی تعلیمات سے اگر اغماض نہ کیا جائے اور اس سے پہلو تہی نہ برتی جائے تو اس کی امن پسندانہ اور انصاف پسندانہ تعلیمات اور اقدامات سے انکار ممکن ہی نہیں، لیکن موجودہ زمانہ میں اسلام کی مقہوریت و مظلومیت کی بنا پر اسکی اچھائیاں بھی لوگوں کی آنکھوں کا تنکا بنی ہوئی ہیں، بلا استثناء کسی خطہ ارضی کے ہر جگہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ، اسلامی تعلیمات کے حاملین کے ساتھ ناروا سلوک اور نا شائستہ برتاو کیا جارہا ہے، اور یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی پلاننگ اور منظّم منصوبے کے تحت دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش زوروں پر ہے کہ اسلام دہشت پسندی کی تعلیم دیتا ہے اور اسلامی علمبردار دہشت گرد ہیں، جب کہ حقیقت سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ کوئی بات کہوں یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ آخر دنیا کو کن باتوں کے ذریعہ اسلام سے بدظن کیا جارہا ہے؟ اور کن راستوں سے دشمن اپنے تیر چلانے کی کوشش کر رہا ہے؟ اسلام میں جہاد ایک مقدس عبادت ہے، مقامات بدلنے سے جسکے مختلف معانی لئے جاتے ہیں، حالات کا سامنا کرنا بھی جہاد ہے، اپنے آپ کو شیطانی وساوس سے محفوظ رکھنا بھی جہاد ہے، بلکہ اسے تو حضور اکرم ﷺ نے جہاد اکبر فرمایا ہے، سچ بات کہنا بھی جہاد ہے، برائی سے روکنا بھی جہاد ہے، اور پھر سر اٹھانے والے فتنوں کو دبانے کے لئے، ظالم و جابر اور غنڈوں کو انکی اوقات میں رکھ کر امن قائم کرنے کے لئے، انسانیت کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والوں کو تہ تیغ کرنے کے لئے اور انسانیت کا راج قائم کرنے کے لئے ہتھیار اٹھانا بھی جہاد ہے، یہی وہ مقدس عبادت ہے جو دنیا کے ظالموں کی آنکھ کا کانٹا بنا ہوا ہے کیونکہ اس سے ظالموں کا ہی صفایا ہوتا ہے، اور اسی عبادت کو وہ اپنی زبان میں دہشت گردی سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیا کو ڈراتے اور دھمکاتے ہیں کہ اسلام خوف و دہشت کا مذہب ہے، کوئی منصف اور غیر جانبدار انسان یہ بتائے کہ کیا سچائی کی تعلیم دینا دہشت گردی ہے ؟ برائی سے روکنا دہشت گردی ہے؟ انسانیت کی حفاظت کرنا دہشت گردی ہے؟ انسانی زندگی کی آلودگیوں اور گندگیوں سے پاک کرنا دہشت گردی ہے؟ جہاد کا مطلوب تو یہی ہے تو پھر یہ دہشت گردی کیسے ہوسکتا ہے؟

آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں کہ دہشت گردی کسے کہتے ہیں اور دہشت گرد کون ہیں؟ اور امن پسندی کسے کہتے ہیں اور مجاہدین کون ہیں؟

تاریخ عالم پر نظر ڈالئے بعثت نبوی سے پہلے کی زندگی پر نظر رکھئے اور بعد بعثت کے بھی احوال پڑھئے، اسلام کی اور حضور اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے دنیا کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی؟ روم و ایران کس دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنی جاہ وجلال اور بقاء سلطنت کی خاطر کیا کچھ کر رہے تھے؟ انسانیت کے ساتھ ان کا کیا رویہ تھا؟ ان کی لڑائیوں اور جنگوں کا مطمح نظر اور نصب العین کیا تھا؟ اور اسلام کے ظہور کے بعد اسلامی جنگوں کا نصب العین کیا تھا؟ اس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ ایک طرف امن کو غارت کرنے کی جنگ تھی اور دوسری طرف امن قائم کرنے کی لڑائی تھی، اور یہ کوئی زبانی جمع خرچ نہیں ہے، عہد اسلامی اول میں ہونے والی تمام جنگوں میں مقتولین کی تعداد ہزار کو بھی نہیں پہونچتی، جس کا مقصد بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر مالک حقیقی کے در پر لانا ہے اور دنیا سے جور وستم کو ختم کرنا ہے، دوسری طرف ایک ایک جنگوں میں ہزاروں انسانی جانوں کو صرف اس لئے ضائع کیا جاتا ہے تاکہ سلطنت قائم رہ سکے، جہاد اور دہشت گردی کے درمیان یہی بنیادی فرق ہے، جنگ کے بارے میں قرآنی تصور یہ ہے ''وقاتلوہم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ'' کہ لوگوں سے اس وقت تک قتال کرتے رہو جب تک فتنوں کی آگ اٹھتی رہے، انسانی جان کے احترام کے متعلق جس مذہب کا تصور یہ ہے "من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانہ قتل الناس جمیعا ومن احیی فکانہ احیی الناس جمیعا" کہ جو ناحق ایک جان کو قتل کرنا پوری انسانیت کے برابر سمجھتا ہے اور ایک جان کی حفاظت کو پوری انسانیت کی حفاظت سمجھتا ہے۔ ایک طرف تو قرآن کا واضح پیغام اور مستحکم نصب العین ہے کہ جنگ اس لئے کی جائے تاکہ امن قائم ہو، انسانیت پنپنے بڑھے اور ہر ایک آزادی کے ساتھ جی سکے اور رہ سکے اور دوسری طرف یہودیوں اور برادران وطن کی مذہبی کتابیں قتال کے سلسلہ میں جو تصور پیش کرتے ہیں اس کا ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے سلطنت کو باقی رکھنا دولت وانبار کو یکجا کرنا اور دنیا والوں کو حقیر وذلیل بنا کر رکھنا۔ محرف توریت اور رگ وید یجروید سام ویدان باتوں سے پٹی پڑی ہیں، اب آپ بتائیں دہشت گرد کسے ہونا چاہئے؟ اسلام یا غیر اسلام، مسلمان یا غیر مسلمان آیئے ایک بار پھر موجودہ دنیا میں قدم رکھ کر پھر سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ معیار کس طرح سے بدلا ہے۔

اس وقت دنیا میں سب سے بڑا مذہب سمجھا جانے والا مذہب عیسائیت ہے جو کبھی تو افراط کا شکار رہا اور کبھی تفریط کا، ایک زمانہ تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ شر کا مقابل شر سے نہ کرنا چاہئے اور یہ بات انکے عقائد میں تھی جس کے نتیجہ میں وہ تفریط کے شکار ہوگئے اور یہودیوں کے مظالم سہتے اور برداشت کرتے رہے ذلت ونکبت برداشت کرتے اور جھیلتے رہے اور پھر جب انہیں جزء حکومت بننے اتفاق ہوا تو وہ افراط کے شکار ہوگئے اور غیر عیسائی کو مارنا انکا مقصد اصلی بن گیا اور پہلی ذلتوں اور نکبتوں کے انتقام کی آگ بھڑک اٹھی جس کے نتیجہ میں وہ تمام ظالموں کی حدیں پار کر گئے۔ اور انسانیت کے ساتھ وہ ننگا ناچ کیا جسے مؤرخ بھی لکھتے وقت قلم سے خون کی چھینٹیں پھینکتا ہے جہاد کے نام پر جو آتنک عیسائیوں نے مچایا اس کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جب ۱۰۹۵ء میں پوپ اربن دوئم نے مسلمانوں کی

نسل کشی کے لئے ایک کونسل بنائی جس میں اس نے جہاد کا اعلان کرتے ہوئے کہا ''ان کافروں سے جہاد کرو جو خداوند یسوع مسیح کی خانقاہ پر قابض ہوگئے ہیں جو تم میں سے اس جہاد میں شامل ہوگا میں اس کے تمام گناہ معاف کردونگا اور اسے بہشت میں داخل کرونگا'' حضرت عیسیٰ کی زخم خوردہ تصویر بنائی اور لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اکسایا بھڑکایا اور لاکھوں جانوں کو یک لخت مردہ کردیا، ۱۱۰۹ء میں جب عیسائیوں نے طرابلس پر حملہ کیا تو وحشیانہ قتل وغارت گری کے ساتھ علمی کتب خانوں کو بھی نذر آتش کردیا، منگول مسیحی اتحاد میں ہلاکو خان کی قیادت میں سولہ لاکھ افراد کو قتل کیا، اسپین میں تیس سے چالیس لاکھ کے درمیان مسلمانوں کو قتل کیا، ۱۹۹۴ء میں روسی فوج نے نہتے چیچن مسلمانوں پر ٹینکوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ اتنی شدید بمباری کی تھی کہ درجنوں شہر اور قصبات کھنڈرات میں تبدیل ہوگئے ایک لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوئے، کوسوو کے مسلمانوں کے ساتھ سرب افواج نے انسانی دشمنی کا جو نمونہ پیش کیا اسے دنیا کبھی نہیں بھلاسکتی سرب فوج کے ظلم کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو لایا جاتا اور ایک ساتھ سب کو یہ کہہ کر قتل کردیا جاتا کہ البانیہ جاؤ وہی تمہارا ملک ہے تم کوسوو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوگے، نائجیریا کے مسلمانوں پر اس جرم میں عیسائیوں کے حملہ شروع ہوگئے کہ وہ اسلامی شریعت نافذ کرنا چاہتے تھے، سوچی سمجھی پلاننگ کے ساتھ مسلمان اقلیت والے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکائی گئی، اکیس فروری ۲۰۰۰ء کدونہ شہر کے فساد میں تقریباً دو ہزار لوگ جاں بحق ہوگئے، ۲۹ فروری کو شہر عابہ میں ایک ہی قبیلہ کے کئی مسلمانوں کی مسخ شدہ لاشیں ملی، بوسینا کے مسلمانوں پر سربیائی فوج کا قہر اس وقت برپا کیا گیا جب اپریل ۱۹۹۲ء میں بوسنیا نے اپنے استقلال کا اعلان کیا رمضان کے آخری عشرہ میں سربیائی عیسائی درندوں نے ایک مسجد میں گھس کر تین ہزار مسلمانوں کو ذبح کر دیا، اور ویڈیو بنا کر یہ پروپیگنڈہ کیا کہ یہ زیادتی سربوں کے ساتھ ہوئی ہے، ایک رپورٹ کے مطابق سربیائی فوج نے عقوبت خانوں میں ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا جب کہ تیس ہزار لاپتہ ہیں اور پندرہ لاکھ پناہ گزیں ہیں ڈھائی لاکھ جیلوں کی سلاخوں میں ہیں، ٹائم میگزین کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۳ء کے درمیان بوسنیا میں ایک لاکھ تیس ہزار مسلمان ہلاک ہوئے بیس ہزار خواتین تشدد کا شکار ہوئیں، ۱۹۹۲ء میں الجزائر میں مسلمانوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا گیا عورتوں بچوں کو ذبح کیا گیا، ماؤں بہنوں کے پیٹ چاک کردئے گئے، برما جو ایک بدھسٹ ملک ہے جہاں ۷۸۸ء سے مسلمان آباد ہیں اسکی ریاستوں میں اراکان ایک ایسی ریاست ہے جہاں ستر فیصد مسلمانوں کی آبادی ہے، ۱۹۴۸ء میں لاکھوں مسلمانوں کو وہاں اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑا، ۱۹۶۲ء کے سرخ انقلاب کے بعد مسلمانوں کا قتل عام کیا جانے لگا، ۲۰۱۷ء قریب میں ہی برما میں مسلمانوں کے ساتھ جس حیوانیت اور بے رحمی کا سلوک کیا گیا انسانیت اسے بھی معاف نہیں کریگی، بلغاریہ کے مسلمانوں کے خلاف ۱۹۷۰ء میں انکے ملی تشخص کو مٹانے کی مہم چھیڑی گئی اور جب مسلمانوں نے مزاحمت کی تو انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا ان کمیونسٹوں نے سیکڑوں مساجد ومکاتب مسمار کئے اور لاکھوں مسلمانوں کو ابدی نیند سلادیا، اس وقت سب سے ظالم اور مجرم ملک جس نے مسلمانوں کو اپنا ٹارگیٹ بنایا اور سرزمین فلسطین پر اپنی ناجائز حکومت کا اعلان کرتے ہوئے خود کو اسرائیل کہا اسنے تو ۱۹۴۸ء

سے لیکر آج تک مسلمانوں کے خون سے ہی اپنی پیاس بجھائی ہے اور مسلسل ان کے خون بہانے میں لگا ہوا ہے جس کا وجود ہی ظلم سے شروع ہوتا ہے، جس نے ابتداء وقت ہی دیر یاسین نامی بستی میں تین سولوگوں کو ذبح کیا اسپتالوں میں گھس کر معذورین کو قتل کیا نہتے فلسطین معصوم بچوں پر جو آئے دن بمباریاں کرتا ہے اور کمزور وناتواں خواتین کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے یہی وہ یہودی وعیسائی ہیں جن کے یہ کرتوت اور ظالمانہ رویہ کو میں نے مختصراً عرض کیا ہے، یہی وہ ظالم ہیں جو خود کو امن پسند انصاف پسند اور اسلام ومسلمان کو دہشت گرد اور آتنگواد کہتے ہیں، یہی وہ خبیث ومجرم جثہ ہیں جس نے انسانیت دشمنی کی تمام تر حدین پار کردیں انسانوں کو جانوروں سے بدتر جانا اور خود کو مہذب اور شائستہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، دوسری طرف انکے کارناموں کو دیکھئے جو آتھگواد کہے جاتے ہیں جب کہ اصلاً امن پسند ہیں، مکہ فتح کیا تو لاتثریب علیکم الیوم کہا، اندلس فتح کیا تو ایلیا اور قوطی قوم کے وقار کو تا آخر قائم رکھا، ہندوستان فتح کیا تو ہندوستانیوں نے انکا بڑھکر استقبال کیا اور اپنا مہمان بنایا عزت دی، اب کوئی منصف غیر جانب دار بتائے کہ اصلی دہشت گرد کون ہیں، وہ جو دشمنوں کو معاف کرتا ہے یا وہ جو نہتوں کو بم کا نشانہ بناتا ہے؟ وہ جو عورتوں کو قتل کرنے سے منع کرتا ہے یا وہ عیسائی درندے جو عورتوں کو تشدد کا شکار بناتے ہیں۔

اب تھوڑی دیر کے لئے ہم سرزمین ہندوستان آتے ہیں جہاں آٹے میں نمک کے برابر کچھ فرقہ پرست متشدد عناصر مسلمانوں کو ملک دشمن قرار دیتے ہوئے انکی قومیت پر سوالیہ نشان اٹھاتے ہیں اور مسلم حکمرانوں پر دہشت گرد اور آتنگواد ہونے کا الزام لگاتے ہیں، اس موقع پر یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ ہندوستان ایک اجڑا ہوا اور لٹا ہوا چمن تھا جہاں انسانوں کو غلام بنا کر رکھا گیا تھا اور یہاں کے راجا ومہاراجا عوام کا خون چوس رہے تھے عامۃ الناس ان راجاؤں سے بری طرح تنگ آچکی تھی جس کا نتیجہ تھا عامۃ الناس نے محمد بن قاسم کو اور انکے امن بھرے پیغام کو قبول کیا، محمود غزنوی کا پرتپاک استقبال کیا اور آنے والے حکمرانوں نے اس اجڑے چمن کو سونے کی چڑیا بنادیا، متحدہ ہندوستان کا تصور دیا، اور زندگی کی لے اور سر سے آگاہ کیا، لیکن اس کے باوجود بھی برادران وطن کو کسی مسلم بادشاہ میں تشدد نظر آتا ہے تو یہ اس کا ذاتی عمل ہے سیاسی عمل ہے اسلامی طرز نہیں ہے، اگر کسی مسلم حکمراں نے کسی ہندو پر چڑھائی کی تو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اسی مسلم بادشاہ نے ہی مسلمان بادشاہ پر بھی چڑھائی کی، کیونکہ ان حملوں کا مقصد ترویج مذہب نہیں بلکہ ترویج سلطنت تھا، اس لئے ان حملوں کو اسلام سے جوڑ کر انہیں دہشت گرد گردانا سراسر غلط اور بے بنیاد ہے، پھر ہندوستان کے غنڈے کون ہیں؟ یہاں کے امن کو غارت کرنے والے کون ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب پورا ہندوستان جانتا ہے یہ سوال محتاج جواب نہیں ہے، جس نے ملک میں رہ کر انگریزوں کا ساتھ دیا وہ دہشت گرد، جس نے گاندھی جی کے قتل کی سازش کی وہ دہشت گرد، جس نے امن کو غارت کرنے کے لئے عبادت خانے منہدم کئے وہ دہشت گرد، جس نے سکھوں کو قتل کیا وہ دہشت گرد، جس نے نہتے معصوم بچوں کو اغوا کیا وہ دہشت گرد، اور جو کوئی بھی ایسا کریگا وہ دہشت گرد کہلائیگا اور وہی اصلی دہشت گرد سمجھا جائیگا۔

☆☆☆

❑ شخصیات

عظیم فاتح حضرت خالد بن ولیدؓ

تحریر: عبدالمنعم الہاشمی ترجمہ: محمد عالم ندوی

حضرت خالد کا پورا نام ابوسلیمان خالد بن ولید بن مغیرہ ہے، ان کا تعلق قبیلہ بنومخزوم سے تھا، اور والد کا شمار سرداران قریش میں ہوتا تھا، والدہ کا نام لبابہ بنت حارث تھا، اور یہ ام المومنین حضرت میمونہ کی بہن تھیں، کعبہ کی تعمیر کے موقع سے حضرت خالد کی قوم نے رکن یمانی اور رکن اسود کا ایک چوتھائی حصہ تعمیر کیا تھا جب کہ مکمل کعبہ کی تعمیر قریش نے کی تھی۔

قبول اسلام:

حضرت خالد کا شمار زمانہ جاہلیت میں بھی شرفاء میں ہوتا تھا، اگر چہ وہ اسلام مخالف گروہ میں شامل تھے، مکہ میں عمرہ القضاء کے موقع سے آپ ﷺ نے حضرت خالد کے بھائی ولید بن ولید سے معلوم کیا خالد کہاں ہے؟ اور فرمایا کہ خالد جیسا ذہین شخص ابھی تک اسلام سے دور کیسے ہے، خالد کی بہادری اور اس کا غصہ اسلام کے ساتھ مل کر کفار کے خلاف استعمال ہوتا تو ہم ان کو دوسروں پر ترجیح دیتے، یہ بات ولید نے اپنے بھائی خالد تک پہنچا دی، اس پیغام کے پہنچتے ہی حضرت خالد نے ہجرت کا ارادہ فرمالیا، ۸ ہجری صفر کی پہلی تاریخ کو دربار اقدس میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا اور شیدایانِ محمد میں اپنا نام لکھایا۔

حضرت خالد خود فرماتے ہیں کہ میں آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور شہادتِ حق کا اعلان کیا، آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور فرمایا میں تمہیں بہت عقلمند سمجھتا ہوں اور مجھے یقین تھا کہ یہ عقلمندی اور دانائی تمہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کردے گی۔

میں نے اللہ کے رسول سے بیعت کی اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اب تک میں راہِ حق میں رکاوٹیں کھڑی کرتا رہا، آپ میرے لئے استغفار کر دیجئے، آپ نے فرمایا: قبول اسلام ماقبل کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، عرض کیا: اللہ کے رسول! میں مزید استغفار کا طالب ہوں، آپ نے دعاء کی اے اللہ یہ خالد ہے اب تک تیری راہ میں رکاوٹ بنا رہا، آج تیرے دربار میں حاضر ہے، اس کی مغفرت فرما۔

حضرت خالد کا کہنا ہے کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا آپ نے جنگی معاملات میں مجھے ترجیح دی۔

حضرت خالد کا مجاھدانہ کردار:

حضرت خالد نے آپ ﷺ کے علم کے سایہ میں شرفِ جہاد حاصل کیا، غزوہ موتہ میں شریک رہے، فتح مکہ کے دن مکہ کے نشیبی علاقہ میں ایک پہاڑ پر چند لوگوں سے جھڑپ ہوئی ان میں سے ۲۸ قتل ہوئے باقی شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ فتح مکہ کے پانچ دن بعد آپ ﷺ نے حضرت خالد کو عزیٰ نام کے بت کو گرانے کے

لئے بھیجا، یہ قریش کا سب سے بڑا بت تھا، حضرت خالد نے اس مہم کو سر کرنے کے لئے ۲۰ صحابہ کرام کو ساتھ لیا، جب سردارانِ قریش کو خالد کی آمد کا پتہ چلا تو یہ لوگ بت کے پاس آئے، اس کی گردن میں لٹکائی اور ایک پہاڑ کی اوٹ میں یہ اشعار گنگناتے ہوئے چھپ گئے۔

اے معبود عزیٰ اپنی مدد کر آج تیرا کوئی مددگار نہیں ہے
تیار ہو جا اور خالد کو اپنے غضب کا شکار بنالے
اے معبود اگر تو نے آج خالد کو ہلاک نہیں کیا
تو آج پھر اپنی شان میں ایک گستاخ کی گستاخی کو برداشت کر
یا تو اس کے لئے تیار یا پھر اپنی مدد خود کر

حضرت خالد بت کے قریب گئے اور یہ اشعار پڑھتے ہوئے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔

اے عزیٰ آج میں تیری خدائی کا انکار کرتا ہوں
تجھے کوئی مجد و بزرگی زیب نہیں دیتی
دیکھ آج اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا

جنگ حنین میں شرکت کی اور اس جنگ میں قبیلہ بنو سلیم کے مجاہدوں کی قیادت فرمائی، اس کے علاوہ اور بہت سی جنگوں میں شریک رہے طائف میں، دومۃ الجندل میں، سواع نامی بت کو گرانے میں، بنو المصطلق کے خلاف جنگ میں، ایک موقع سے آپ ﷺ نے آپ کو چار سو لوگوں کے ساتھ نجران کی جانب بھیجا تا کہ وہاں لوگوں تک اسلام کا پیغام اور تعلیماتِ نبوی پہنچائیں، آپ کی محنت سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا، حضرت خالد سب لوگوں کو لے کر حاضرِ خدمت ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے دعائیں لیں۔

حضرت خالد نے آپ ﷺ کی زندگی میں بہت سے معرکہ سر کئے کبھی آپ کے سفیر رہے کبھی قیادت کا کام انجام دیا مختصر یہ کہ آپ کی پاک صحبت سے فیضیاب ہونے کے ساتھ ساتھ نبوی علم کے نیچے بہادری کے جوہر دکھا کر سیف اللہ کا خطاب جیتا۔

مرتدین سے جنگ:

اللہ کے نبی کی وفات کے بعد ارتداد کا فتنہ کھڑا ہوا، حضرت ابوبکر نے مرتدین سے مقابلہ کے لئے گیارہ قائدین کا انتخاب کیا، حضرت خالد کو طلیحہ اسدی اور اس کے بعد مالک بن نویرہ سے نپٹنے کا حکم دیا، حضرت خالد نے اپنے لشکر کے ساتھ مقام زاحہ پر طلیحہ اسدی سے مقابلہ کیا، دونوں جانب سے مقابلہ سخت ہوا لیکن طلیحہ نے مسلمانوں کا پلہ بھاری دیکھا تو اپنی بیوی کو لے کر میدان سے فرار ہو گیا، اعلان کر دیا کہ اے فزارہ کے لوگو! اگر تم بھی ایسا کر سکتے ہو تو کرو اور اپنی جان بچاؤ، بالآخر طلیحہ کا فتنہ ختم ہوا۔

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خالد بن ولید نے مقام بطاح کا رخ کیا جہاں کہ مالک بن نویرہ ٹھہرا ہوا تھا، وہاں جا کر دیکھا کہ میدان خالی پڑا ہے، مالک بن نویرہ نے اپنی فوج کو مارے خوف کے منتشر کر دیا، اس حالت کو دیکھ کر حضرت خالد نے اسلامی جذبہ رحم سے سرشار ہو کر اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ ان میں سے جو بھی حق کی بات ماننے کو تیار ہو، اس کو باہر لے آؤ یہ لوگ مالک کو پکڑ کر باہر لائے، مالک نے کہا میں نماز پڑھ سکتا ہوں لیکن زکوۃ نہیں دوں گا، حضرت خالد نے کہا اسلام کا مطالبہ دونوں ارکان سے ہے، مالک آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے بولا: کیا یہی سب تمہارے آقا کی تعلیم ہے، حضرت خالد نے کہا ان کی تعلیم کا صدقہ ہے کہ تو ابھی تک زندہ ہے، ورنہ تیرا سر دھڑ سے جدا ہو چکا ہوتا، پھر کچھ دیر تک زبانی جنگ ہوتی رہی اس کے بعد حضرت خالد نے اس کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی لیلیٰ سے شادی کر لی۔

حضرت ابوقتادہ انصاری یہ سب ماجرا دیکھ رہے تھے، انہیں لگا کہ خالد نے ناحق مالک کو قتل کیا ہے لہذا وہ سرپٹ اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے حضرت ابوبکر کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت عمر بھی ابوبکر کے پاس ہی موجود تھے، ابوقتادہ نے عرض کیا: خلیفۃ الرسول! خالد کی تلوار میں کھوٹ ہے اس میں نادانی اور ظلم کے نشانات دکھتے ہیں اور مالک کا پورا ماجرہ کہہ سنایا، عمر غصہ سے بے تاب ہوئے مگر کچھ نہ بولے، حضرت ابوبکر نے خالد کو بلا کر وضاحت طلب کی، ان کی بات سے ابوبکر مطمئن ہوگئے اور عمر سے کہا عمر خالد نے مسئلہ میں تدبر کیا اور صحیح نتیجہ تک رسائی نہ ہوسکی، لہذا نظر انداز کرو، دوسری بات میں اس کی تلوار کو نیام میں نہیں رکھنا چاہتا جس کو خود رسول اللہ نے کفار پر مسلط کیا ہو۔

اب حضرت خالد نے یمامہ کا رخ کیا اور مسیلمہ کذاب کا خاتمہ کرنا چاہا جبکہ اس سے پہلے عکرمہ ابن ابوجہل شرحبیل بن حسنہ حملہ کر چکے تھے لیکن کامیابی نہ مل سکی تھی، حضرت خالد مقدمۃ الجیش میں تھے اور دونوں جانب زید بن خطاب اور حذیفہ بن عتبہ قریشی تھے، مسلمانوں میں مہاجرین کا علم سالم مولیٰ ابی حذیفہ کے ہاتھ میں تھا اور انصار کا علم ثابت بن قیس کے ہاتھ میں جبکہ عرب کے اتحادی قبائل خالد رضی اللہ کے علم کے نیچے تھے، یمامہ میں مقامِ عقرباء پر دونوں فوجوں کا سامنا ہوا، گھمسان کا رن پڑا، دونوں فریق بے جگری سے لڑ رہے تھے، ابتدا میں مسلمانوں کو شکست ہو رہی تھی اور حالات اتنے نازک ہوگئے تھے کہ بنو حنیفہ کے لوگ حضرت خالد کے خیمہ میں گھس آئے لیکن مسلمانوں نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ دشمن فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، حضرت خالد یہ سمجھ گئے کہ جنگ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ کذاب کو تہ تیغ نہ کر دیا جائے، مسلمانوں نے دادِ شجاعت دیتے ہوئے خاص کر براء بن مالک نے قلعہ کی دیوار کو پھاند کر اور قلعہ میں گھس کر مجاہدین کے لئے دروازہ کھول دیا، مجاہدین اندر داخل ہوئے اور ہزاروں کذابوں کو تہ تیغ کر ڈالا، کذاب بھی اسی مڈبھیڑ میں مارا گیا، اس طرح جھوٹی نبوت کا قلعہ مسمار ہوگیا۔

عراق:

حضرت خالد یمامہ سے کامیاب ہوکر لوٹے تو حضرت ابوبکر نے عراق کی مہم آپ کے سپرد کی، حضرت خالد دو ہزار لوگوں کو لے کر عراق کی جانب نکلے، راستہ میں قبیلہ ربیعہ اور مضر کے آٹھ ہزار لوگ مزید شامل ہوگئے، اس طرح آٹھ ہزار وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو مثنی بن حارثہ کی قیادت میں پہلے سے عراق میں برسرِ پیکار تھے یہ کل اٹھارہ ہزار مجاہدین کی فوج بن گئی جس کی قیادت حضرت خالد بن ولید فرما رہے تھے۔

جنگ کا آغاز وہیں سے ہوا، جہاں پہلے سے مثنی بن حارثہ لڑ رہے تھے اور میدان جنگ انبار کا ایک گاؤں منار تھا جو کہ بصرہ الجہ اور الیس کے قریب کی جگہ ہے، آپ کے مدمقابل ایرانی فوج تھی، جو کہ قلعہ بند ہوچکی تھی اور ان کا قائد اپنے حاکم اور بیٹے کی موت کی خبر سن کر فرار ہوچکا تھا، حضرت خالد نے لشکر کشی کی اور معمولی جنگ کے بعد اسے فتح کرلیا، آپ نے ان لوگوں کو اسلام، جزیہ اور جنگ کا اختیار دیا، ان لوگوں نے جذیہ منظور کیا اور حیرہ کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے، مسلمانوں نے یہاں رہ کر امن و امان قائم کیا یہاں کے باشندوں کی اصلاح کی، اب ایرانیوں نے عین التمر میں اپنی طاقت کو از سرِ نو جمع کرنا شروع کیا، ایرانی قائد مہران بن مہدام نے عرب وعجم پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کرلی، عربی فوجیوں کی کمانڈ مہران نے عفہ بن ابی عقہ کے سپرد کر رکھی تھی، جب ان لوگوں کو خالد رضی اللہ کی آمد کا پتہ چلا تو عفہ ابن ابی عقہ نے

مہران سے کہا: عربی فوج سے پنجہ آزمائی کا ہنر عربوں ہی کو آتا ہے لہذا آپ قلعہ بند ہوکر نظارہ دیکھئے میں خالد سے نمٹتا ہوں، عفہ مقامِ عراء پر لنگر انداز ہوا اور اپنی صفوں کو درست کر رہا تھا، حضرت خالد نے اپنے لشکر سے سے کہا تم میرے دائیں بائیں نظر رکھو میں عفہ پر حملہ کرتا ہوں، حضرت خالد نے پلک جھپکتے ہی عفہ پر حملہ کر دیا، اس کو گھیر کر گرفتار کر لیا، فوج تتر بتر ہوگئی اور شکست کھا کر بھاگ نکلی، جیسے ہی یہ خبر مہران کو پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوا اور اپنی فوج لے کر بھاگ گیا، باقی ماندہ فوج کو مسلمانوں نے گرفتار کر کے قتل کر دیا، جنگ کے بعد حضرت خالد نے قریبی علاقوں دومۃ الجندل وغیرہ فتح کر کے شام کا رخ کیا اور وہاں رومیوں کو شکستِ فاش دی۔

ملک شام:

حضرت ابوبکر نے ایک موقع سے ارشاد فرمایا: میں اہل روم کے غرور کو خالد بن ولید کے ذریعہ خاک میں ملا دوں گا، عراق کی جنگ سے فارغ ہوکر حضرت خالد بن ولید خاموشی سے مکہ آئے اور حج کر کے واپس چلے گئے یہاں تا کہ حضرت ابوبکر کو بھی علم نہ ہوا، معلوم ہونے پر حضرت ابوبکر نے حضرت خالد کو ایک خط لکھا اور فرمایا، خالد یرموک میں مسلمانوں سے جا کر ملو وہاں مسلمانوں کی پوزیشن ٹھیک نہیں ہے، اور آپ کا راز دارنہ طور پر مکہ آنا اور واپس چلے جانا بالکل مناسب نہیں تھا، اس لئے کہ یرموک میں اس وقت مسلمانوں کی جو صورتِ حال ہے وہ خدا کی مدد اور تمہارے ذریعہ ہی درست ہوسکتی ہے، لہذا اے ابوسلیمان اللہ تمہیں فتح و نصرت سے نوازے اور سرخرو رکھے اپنے اس کام کو انجام دو اور یاد رکھو ذرا بھی کبر و بڑائی کا شائبہ تمہارے دل میں پیدا نہ ہو اور نہ ہی اپنے کسی کام پر تکبر کرنا کیوں کہ مجد و بزرگی، کبر و بڑائی سب خدا ہی کو زیب دیتی ہے۔

جنگ یرموک:

حضرت خالد جنگ یرموک کے لئے شام پہنچے، وہاں رومیوں کی تعداد زیادہ تھی اور مسلمانوں کے حوصلے پست ہو رہے تھے جبکہ قیادت حضرت ابو عبیدہ، عکرمہ ابن ابی جہل، عمرو بن العاص فرما رہے تھے لیکن جب مسلمانوں نے حضرت خالد کو آتے دیکھا تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، حضرت خالد نے فوج کو منظم کیا اور جنگ کی تیاری میں مصروف ہوگئے، فوج میں اکثریت کردوں کی تھی، جنگ شروع ہوئی اور گھمسان کا رن پڑنے لگا کہ اچانک خالد کا سامنا ایک رومی قائد جرجو سے ہوا، اس نے خالدؓ سے اسلام کی حقانیت پر مناقشہ شروع کیا، حضرت خالد نے اپنے دلائل کے ذریعہ اس کو اسلام کا قائل کر لیا اور وہ مشرف باسلام ہوگیا، ابھی جنگ جاری تھی، رومیوں نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ مسلم فوج منتشر ہونے لگی حضرت خالد نے فوج کو جمع کر کے ایسا پرزور ہلہ بولا کہ رومی اس کی تاب نہ لا سکے اور میدان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے، یہ جنگ یرموک بھی مسلمانوں کی فتح کے ساتھ ختم ہوئی، اب حضرت ابوعبیدہ نے آپ کو شام کی چھوٹی چھوٹی مہم سر کرنے کو بھیجا جن کو آپ نے بحسنِ وخوبی انجام دیا۔

وفات:

حضرت خالد بن ولید سکرات کے عالم تھے، لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں: زندگی میں جہاد سے پہلو تہی مت برتنا، پھر فرمایا میں نے تقریباً سو جنگیں لڑیں، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں کسی تلوار یا نیزہ کا نشان نہ ہو، لیکن افسوس میں شہادت سے محروم رہا، اور آج ٹانگیں رگڑتا ہوا بستر پر مر رہا ہوں۔ اللہ اپنی تلوار اور اسلام کے اس جانباز پر رحم فرمائے۔

☆☆☆

❑ روداد

بے خبر کی خبر

(جمہوریہ کانگو کی مذہبی، علمی، دعوتی اور جغرافیائی معلومات پر مشتمل ایک خوبصورت اور پر لطف روداد)

سراج اکرم قاسمی

(مدرسہ الہدایہ، کنشا، کانگو، افریقہ)

(زندگی کے تقریبا چالیس سال "جنت ارضی" کی پر بہار فضاؤں میں گزرے، پھر دل ناداں نے صحرائے افریقہ کی خاک چھاننے کی ٹھانی، اور بندہ بروز جمعرات 15 ذی الحجہ 1438ھ = 7/ستمبر 2017ء کو وسطی افریقہ کی سرزمین پر آ گیا، اب کچھ باخبر بزرگوں اور ہم عصروں کا اصرار ہے کہ مجھ جیسا بے خبر انھیں یہاں کی خبر دے، میں نے بھی اس امید پر ہامی بھر لی ہے کہ شاید یہ تحریر کسی دل کو دستک دے اور وہ صحرا نوردی کے لیے تیار ہو پھر اس کی قربانی اور محنت و جاں فشانی کے نتیجے میں دشت افریقہ کے ایمانی کشت زاروں میں باغ و بہار پیدا ہو (آمین) (سراج)

بندہ وسطی افریقہ کے ایک ملک "جمہوری جمہوری کانگو" میں ہے، اسے عربی میں "جمورۃ الونغو الدمقراطۃ" انگریزی میں congotheofrepublicDemocratic فرانسیسی میں congodudemocratiqueRepublique اور اختصارا "کانگو" کہا جاتا ہے، "کانگو برازاویل" سے ممتاز کرنے کے لیے اسے "کانگو کنشاسا" بھی کہتے ہیں 1971 تا 1997 کے درمیان اس کا نام "زائیر" بھی رہا ہے، 1960 میں اس نے "بلجیئم" سے آزادی حاصل کی۔

کانگو کی سرحدیں:

کانگو کی سرحدیں شمال میں جنوبی سوڈان اور مرکزی افریقہ سے، مشرق میں یوگنڈا، روانڈا، برونڈی اور تنزانیہ سے، جنوب میں زامبا اور انگولا سے، اور مغرب میں کانگو برازاویل سے لگتی ہیں، اس کے جنوب مغرب میں کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس کی لہریں بھی موجیں مار رہی ہیں۔

کانگو قدرتی وسائل سے معمور دنیا کا ایک مال دار ترین ملک ہے؛ مگر سیاسی اختلافات اور باہمی رسہ کشی نے اسے "أفقر دول فی العالم" (دنیا کا غرب ترین ملک) بنا دیا ہے۔

کانگو کا رقبہ اور آبادی:

رقبے کے اعتبار سے یہ افریقہ کا دوسرا اور دنیا کا گیارہواں سب سے بڑا ملک سمجھا جاتا ہے، جو 2345410 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے یہ افریقہ کا چوتھا اور پوری دنیا کا سترہواں بڑا ملک شمار ہوتا ہے جس کی آغوش میں 85 ملین سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔

کانگو کا دار الحکومت:

کانگو کا دار الحکومت "کنشاسا" ہے جو آبادی اور رقبہ ہر دو اعتبار سے ملک کا سب سے بڑا شہر سمجھا جاتا ہے لاگوس (نائجیریا) اور قاہرہ (مصر) کے بعد اس کا شمار براعظم افریقہ کے تیسرے سب سے بڑے شہروں میں ہے، جس میں ملک کے ایک تہائی سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔

2050ء میں دنیا کے جن 10 بڑے شہروں میں سب سے زیادہ آبادی ہونے کا امکان ہے ان میں کنشاسا بھی شامل ہے، اور ایک اندازے کے مطابق 2075 میں یہ دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہوگا۔

اے کاش داعیان اسلام کے قافلے ابھی سے یہاں خیمہ زن ہوتے تاکہ مستقبل میں دنیا کی یہ سب سے بڑی آبادی نغمۂ توحید سے معمور ہوتی!

" کنشاسا" کو پیرس کے بعد سب سے بڑا فرانسیسی بولنے والا شہر کہا جاتا ہے، اور یہی وہ بدنصیب شہر ہے جہاں سے غیر فطری عمل کی وجہ سے 1920ء کی دہائی میں ایڈز جیسے مہلک مرض کی ابتدا ہوئی۔

کنشاسا کا محل وقوع:

یہ شہر دریائے کانگو کے مشرقی کنارے آباد ہے، ٹھیک اس کے بالمقابل مغربی کنارے پر جمہوری کانگو کا پایۂ تخت "برازاویل" واقع ہے، ان دونوں شہروں کو "جڑواں شہر" بھی کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ دو الگ الگ ملکوں کے شہر ہیں اور دونوں کے درمیان "دریائے کانگو" حائل ہے۔

دریائے کانگو:

اس دریا کا قدیم نام "زائیر" ہے، یہ اپنی گہرائی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے گہرا دریا سمجھا جاتا ہے، اس کی گہرائی 220 میٹر سے بھی زیادہ مانی گئی ہے، پانی کی مقدار کے لحاظ سے (جسے یہ دریا نکالتا ہے) پوری دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے، اس کے طول کی پیمائش 4,700 کلومیٹر (یعنی تقریباً 2,900 میل کے برابر) کی گئی ہے، اس طرح یہ اپنے طول کے لحاظ سے پوری دنیا میں آٹھویں نمبر پر اور براعظم افریقہ کے لحاظ سے دریائے نیل کے بعد دوسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔

یہ دریا زامبیا کے شمال مشرق کے اونچے علاقوں سے گزرتا ہے، پھر بحر ہند سے سات سو کلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے بھی اوپر بہتے ہوئے بالکل سمت مخالف میں دکھن، پچھّم دکھن اور پورب پچھّم کی سمتوں سے ہوتے ہوئے جمہوریہ کانگو کے پاس بحر اٹلانٹک میں گر جاتا ہے، اس کا گزر شمالی منگولیا، کیمرون اور تنزانیہ کے پاس سے بھی ہوتا ہے۔

خصوصی احوال:

داعی اسلام حضرت مولانا محمد طارق جمیل صاحب نے اپنی کسی تقریر میں مسلمانوں کی بدیر خوابی اور بدیر بیداری پر عار دلاتے ہوئے کہا تھا: "بعض افریقی ممالک میں سرِ شام دکانیں بند ہو جاتی ہیں، لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی زندگی کا قافلہ پوری توانائی کے ساتھ معاش کی تگ ودو میں مصروف ہو جاتا ہے"

کانگو میں اس کا مشاہدہ بچشم سر ہو رہا ہے، شام کے 5 بجے دکانیں بند ہو جاتی ہیں، رات آٹھ نو بجے تک پورا شہر سناٹے میں ڈوب جاتا ہے، البتہ چند ایک بڑے بڑے "مول" ہیں جنھیں رات دس گیارہ بجے تک کھلا رکھنے کی اجازت ہے۔

یہاں ٹریفک نظام ایک بڑا مسئلہ ہے، اس لئے بندہ ایک دن "دارالعلوم الایمان" سے "مدرسۃ الہداۃ" کے لیے ہندوستانی ذہنیت کے مطابق فجر کے معًا بعد روانہ ہوا؛ تاکہ بھیڑ کا سامنا نہ کرنا پڑے؛ لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دوپہر اور صبح کے درمیان ٹریفک ہجوم میں برائے نام فرق ہے۔

کانگو وقت کے اعتبار سے ہندوستان سے ساڑھے چار گھنٹے پیچھے اور عربی تاریخ میں سعودیہ کا تابع ہے۔

دوپٹے کی قید سے آزادی:

بلاتفریق مذہب وملت یہاں عورتوں کے سر اور سینے دوپٹے کی قید سے آزاد اور نصف قدم لباس کی زینت سے محروم ہوتے ہیں، ان کا عمومی لباس ہاف گنجی، گھٹنے تک ہاف پینٹ یا اسی کے ہم مثل کوئی اور لباس ہوتا ہے، ایسا برہنہ لباس تو ہندوستان میں مغربی تہذیب کی پرستار انتہائی جدت پسند عورتیں بھی پہننے میں عار محسوس کریں گی، اس لیے یہاں نظر؛ بلکہ ہم ہندوستانیوں کے لیے اپنی عصمت وعفت کی حفاظت وصیانت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

شراب وزنا کی کثرت:

یہاں ضروری اشیائے خوردونوش کی گو قلت ہے، اکثر لوگ ایک ہی وقت کھاتے ہیں؛ مگر زنا اور شراب کی وہ کثرت ہے کہ الامان والحفیظ!! "ان کی صبح کا آغاز جام ومینا سے ہوتا ہے، راتیں ساقیان دل کش اداؤں کی بانہوں میں گزرتی ہیں، اور دن راستے میں گرتے پڑتے لڑھکتے ہوئے کٹ جاتا ہے"

میرے ایک بااعتماد دوست نے بتایا کہ "میری آنکھوں نے یہاں وہ دن بھی دیکھے ہیں کہ امام صاحب "لا تقربوا الصلوۃ

وانتم سکاریٰ "سے بے خبر، نشے میں مدہوش مصلے پر چڑھ گئے اور عھلاہ عاقبر (اللہ اکبر) کی بھاری بھرکم صدا سے مسجد کانپ اٹھی۔

ابھی ہفتہ پہلے میں نے خود دیکھا کہ ایک دربان دوسرے دربان کو زدوکوب کررہا ہے، میرے پوچھنے پر پہلے نے بتایا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے، امام صاحب کا حکم ہے کہ یہ کسی طرح مسجد میں داخل نہ ہونے پائے۔

کانگو کے مذاھب:

کانگو میں بنیادی طور پر دو ہی آسمانی مذاہب ہیں: اسلام اور عیسائیت، دیگر مذاہب کے ماننے والے یا تو ہیں ہی نہیں یا ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

عیسائی حضرات 70 تا 94 فی صد اور صاحبان تخت و تاج ہیں، جب کہ (آہ!) بے چارے مسلمان 6 تا 15 فی صد اور ارباب اقتدار کے چشم وابرو کے اشارے کے محتاج، دست نگر اور قلاش ہیں، جنھیں کسی بھی سفید فام کے سامنے "الجوع الجوع" بھوک بھوک کی فریاد اور دست سوال دراز کرنے میں بھی کوئی ننگ و عار نہیں۔

کانگو میں اسلام:

یہاں اسلام کی تاریخ کوئی زیادہ قدیم نہیں، 1830ء کی دہائی میں اس خطۂ ارض پر عرب تاجروں کے ذریعے اسلام کی پہلی کرن نمودار ہوئی جس کی روشنی پھیلی اور پھیلتی ہی چلی گئی، پر آخری دین سماوی کی ضیاباری سے کانگو کا جو حصہ سب سے پہلے درخشاں ہوا وہ "مانیما" ہے۔

مقامی اہل علم کی رائے یہ ہے کہ یہ "من اللہ علینا، أنعم علینا بانعمة " کی تخفیف یا بگڑی ہوئی شکل ہے، یعنی جب عربوں نے یہ دیکھا کہ یہ سرزمین تمام قدرتی ذخائر: سونا، چاندی، پٹرول، کوئلہ، لکڑی، الماس اور رانگے پیتل سے مالا مال ہے تو ان کی زبانوں پر بار بار یہ جملے آنے لگے کہ رب کائنات کا بڑا انعام و احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہاں پہنچادیا۔

مانیما کانگو کے مشرقی خطے میں واقع ہے جہاں کی فضاؤں میں آج بھی ان نفوس قدسیہ کے انفاس کی خوشبو، رچی بسی صاف محسوس ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ کانگو کے اس حصے میں اسلامی تہذیب وتمدن کے نشانات زیادہ گہرے اور نمایاں نظر آتے ہیں۔

کانگو میں اسلام بڑی آسانی سے دیگر تمام آسمانی مذاہب سے پہلے داخل ہوا اور برق رفتاری سے پھیلا، امن وسلامتی اور اخوت و محبت سے بھرے اس دین کی ترویج و اشاعت میں کسی خاص پریشانی اور دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا؛ بلکہ مسلمانوں کے عمدہ اخلاق، صاف ستھرے معاملات اور خلق خدا کے ساتھ ان کی سچی ہم دردی کو دیکھ کر لوگ خود بخود اس دین میں داخل ہونے لگے اور اس کثرت سے اس کے پرامن سائے میں آئے کہ یہاں خلافت ارضی بھی قائم ہوگئی۔

من درچه خیالم وفلک در چه خیال:

یہ خلافت "دولت مستعجل" ثابت ہوئی، ابھی اس کے قدم پوری طرح مضبوط بھی نہ ہونے پائے تھے کہ یلجیموں نے 1885ء میں اس پر قبضہ کرلیا، اس قبضے سے ان کے تین مقاصد تھے:

1 یہاں کے قدرتی ذخائر کو ہتھیانا

2 عیسائیت کی ترویج واشاعت

3 مسلمانوں کے خلاف مقامی آبادی کے دلوں میں نفرت و عداوت کے شعلے بھڑکانا اور ان کی بیخ کنی کرنا۔

ان ہر سہ مقاصد میں وہ پوری طرح کام یاب بھی رہے، ملک کی دولت کو اتنا لوٹا کہ اسے مفلس وقلاش بنادیا مسیحیت جو اسلام کے بعد یہاں آئی تھی، 94 فی صد تک پہنچ گئی اور تیسرے سب سے بڑے مذموم مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے 2 اپریل 1893ء میں 70 ہزار مسلمانوں کو خاک وخون میں تڑپا دیا، اس الم ناک واقعے نے بقیہ مسلمانوں کے دلوں میں خوف و ہراس اور ناامیدی کی کیفیت پیدا کردی اور ان میں سے بیشتر پڑوسی ملکوں کی طرف ہجرت کرگئے، رہی سہی کسر 1922ء کے خونیں ڈرامے نے پوری کردی، ایک سال کے عرصے میں چھ لاکھ مسلمان تہ تیغ کیے گئے، مزید ایسے قوانین وضع کیے گئے جن سے، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوجائے اور وہ عیسائیت کے دامن ہی میں اپنی حفاظت محسوس

کریں۔

اسکول و کالج کے دروازے صرف انھیں بچوں کے لئے کھلے رکھے گئے جن کے والدین عیسائی ہوں، پورے ملک میں عیسائی مبلغین و دعاۃ کو کثرت کے ساتھ پھیلا گیا اور مشنری کا ایسا مضبوط جال بچھایا گیا جو آج بھی پوری طرح مستحکم ہے، تعلیمی فیس اتنی مہنگی کردی گئی کہ عام آدمی کے لئے بآسانی ادائیگی ممکن نہ ہو، فیس کی معافی یا ادائیگی کا وعدہ کیا گیا، اعلی تعلیم اور نوکری کی ذمے داری لی گئی بشرطیکہ طالب علم عیسائیت کا اعلان کرے اور یہ یقین دہانی کرائے کہ وہ آئندہ بھی مسیحیت ہی پر قائم رہے گا، چناں چہ کانگو میں آج بھی ہزاروں افراد آپ کو ایسے مل جائیں گے جو نام سے محمد، احمد اور عثمان وعلی ہوں گے؛ لیکن ہوں گے عیسائی، وجہ یہ ہے کہ وہ پیدا تو مسلمان گھرانے میں ہوئے؛ لیکن تعلیم وتعلم کی دشواری اور معاشی تنگیوں نے انھیں راہیں بدلنے پر مجبور کردیا۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے : بلجیمیوں کے قدم جب کانگو میں مضبوط ہوگئے اور انھیں یہ محسوس ہونے لگا کہ اب انھیں یہاں سے کوئی بے دخل نہیں کرسکتا تو ان کا ظالمانہ ہاتھ عام باشندوں کی طرف بڑھا، اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئے کہ کفر کے ساتھ تو حکومت قائم رہ سکتی ہے؛ لیکن ظلم کے ساتھ نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی اور ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی کہ بلجیمی لوگ محض اس ملک کی دولت چاہتے ہیں، انھیں ہم سے کوئی محبت نہیں، چناں چہ "لومومبا" کی قیادت میں تحریک آزادی شروع ہوئی اور خاک وخون کے دریا کو عبور کرنے کے بعد 30 جون 1960ء میں آزادی کی دولت ملی اور ملک کا دستور جمہوری قرار پایا؛ لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس آزادی اور انقلاب حکومت سے مسلمانوں کے مسائل سلجھنے کے بجائے مزید الجھتے گئے؛ کیوں کہ مسند نشین اب بھی کلیسیائی افراد ہی تھے، صرف ان کے رنگ اور ان کی نسبتیں بدل گئی تھیں، اس لیے اصحاب اقتدار کی ساری تگ ودو مسیحیت کی نشر واشاعت کے لیے وقف ہوگئیں، اور بعض ایسے قانون بھی بنائے گئے جن کی رو سے مساجد ومعابد اور دینی مدارس و مکاتب کی تعمیر وتشکیل ممنوع قرار پائی؛ بلکہ چند تاریخی مسجدیں کلیسا میں تبدیل کردی گئیں، ہندوستانی، پاکستانی اور لبنانی مسلم تجار جو اس ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے ان پر طرح طرح سے شکنجہ کسا گیا؛ تاکہ وہ یہاں سے رخصت ہو جائیں، یہ سلسلۂ ستم جاری رہا کہ 1972 کا سورج طلوع ہوا جس کے بعد مسلمانوں کو کچھ راحت ملی۔

تفریق ملل، حکمت افرنگ کامقصود:

کہنے کو تو کانگو ایک جمہوری ملک ہے جس کا کوئی مذہب نہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت یہاں بری طرح پامال ہے، پارلیمنٹ میں عیسائی ہی ممبران ہیں، جس کی وجہ سے وہ قانون بآسانی منظور ہوجاتا ہے جس کا تعلق عیسائیت کی ترویج وارتقا سے ہو خواہ وہ اسلام سے متصادم ہی کیوں نہ ہو، عیسائیوں کے سبھی تہواروں کے موقع پر چھٹیاں ہوتی ہیں؛ لیکن مسلمان عیدین کی تعطیلات کے لیے بھی اب تک ترس رہے ہیں، والمستقبل بیداللہ۔

رحمتیں ہیں تیری، اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

پارلیمنٹ کی 500 نشستوں میں سے صرف 5 نشستیں مسلمانوں کے لیے ہیں اور وہ بھی نہیں پہنچ پاتے، اس لئے کوئی مسلم وزیر نہیں، 400 سیاسی پارٹیوں میں سے محض چھ مسلم سیاسی پارٹیاں ہیں؛ پر وہ بھی ہمیشہ ہزیمت وشکست سے دوچار رہتی ہیں۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی:

1972ء میں مسلمانوں کو اتنا سکون ضرور ملا کہ اسلام بحیثیت مذہب سرکاری سطح پر بھی قبول کیا گیا، جس کے نتیجے میں انھیں مدارس ومساجد اور دینی مکاتب قائم کرنے کی اجازت ملی (ورنہ پہلے اس پر بھی پابندی تھی) پر بے چارے مسلمان اپنی شدید غربت وافلاس کی وجہ سے اس اجازت سے بھی اب تک عمومی فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں، اسّی نوّے فی صد مسلمان ناخواندہ اور بے کار ہیں، نہ ان کے پاس دینی تعلیم ہے نہ

دنیاوی، اور نہ ہی کوئی نوکری اور تجارتی کاروبار پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بھٹگی کا کام بھی ان کے لیے کوئی عار نہیں۔

مساجد عموماً قرآن کریم اور مصحف سے خالی ہیں، اسلامی لٹریچر تو تقریبا یکسر مفقود ہیں، کنشاسا جیسے بڑے شہر میں ایک ایسا کتب خانہ نہیں جہاں سے آپ "نورانی قاعدہ" بھی خرید سکیں۔

کانگوچوں کہ "براعظم افریقہ" کے وسط میں واقع ہے اس لیے مذہبی حیثیت سے بھی عیسائیوں کی ہمیشہ اس پر نظر رہی ہے، یہاں 3746 کلیسائیں اور 215449 عیسائی مبلغین و دعاۃ انتہائی سرگرم اور پورے ملک میں ہردم اس طرح رواں دواں رہتے ہیں، جیسے خون رگوں میں اور بجلی تاروں میں، ایک سچے مسلم داعی کے لیے یہ منظر کتنا شاق اور دل دوز ہوتا ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ نہیں لگا سکتے جن کی نگاہوں سے یہ منظر اوجھل ہے۔

ہائے ارباب نظر کی بے کسی، بے چارگی
آنکھ سب کچھ دیکھتی ہے اور زباں خاموش ہے

عیسائی مشنریاں:

ملک کے طول وعرض میں عیسائی تبلیغی اداروں کا ایک مضبوط و مستحکم اور منظّم جال پھیلا ہوا ہے، یہ ادارے یہاں کی غربت و افلاس سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہیں، یتیموں، غریبوں اور بیواؤں کی کفالت، کم زوروں اور ضعیفوں کی اعانت ونصرت، بچوں کی تعلیم و تربیت، بوڑھوں کی دیکھ ریکھ اور بیماروں کی طبی خدمات کے پردے میں عیسائیت کی خاموش؛ مگر مؤثر تبلیغ وتشہیر کرتے ہیں، مجھے یہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ جو کوئی بھی اہل کانگو کے لیے مادی وسائل فراہم کرے گا تو یہ لوگ مذہبی اور روحانی اعتبار سے اس کی طرف کھنچتے چلے جائیں گے، چناں چہ مسلمان بھی بسا اوقات دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے انھی ذرائع سے کام لیتے ہیں جگہ جگہ عیسائیت کی معلومات کے لیے کتب خانے موجود ہیں، مسلم علاقوں میں تفریح گاہوں کے نام پر ایسے چرچ قائم ہیں جن میں حضرت عیسی وغیرہ کی کوئی تصویر موجود نہیں۔

عیسائیت کے پہلو بہ پہلو شیعیت بھی سرگرم عمل ہے، گو ابھی ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے؛ لیکن ان کے بیشتر افراد تجارت سے وابستہ ہیں، جن کے بڑے بڑے تجارتی کاروبار ہیں، ایران سے جن کے روابط بڑے گہرے اور مضبوط ہیں، شیعی علما کی آمد ورفت برابر جاری رہتی ہے، کئی یونیورسٹیاں بھی ہیں جن میں ایرانی اساتذہ تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

گنتی کی انجمن ہے اس ملک کی فضا میں: ملک کی وسعت وآبادی کو دیکھتے ہوئے اسلامی تنظیمیں برائے نام ہیں، سعودیہ، قطر اور سوڈان کی تنظیمیں تو ہیں؛ لیکن ان میں سے بیشتر کا تعلق دینی امور کے بجائے محض رفاہی کاموں سے ہے کانگو کی سب سے بڑی تنظیم "الجمیعۃ السلامۃ" ہے، جو حکومت سے منظور شدہ؛ بلکہ اسی کے اشارے پر قائم کردہ ہے، اسے ہندوستان کا "مسلم پرسنل لا بورڈ" سمجھنا چاہیے؛ لیکن وسائل کے فقدان، رجال کار کی قلت اور عدم اتحاد کی وجہ سے یہ تنظیم بورڈ کی طرح متحرک، فعال اور مؤثر نہیں، بورڈ جس طرح اپنے موقف اور مسلمانوں کی متحدہ آواز کو پوری قوت وطاقت اور جرأت وبسالت کے ساتھ حکومت وقت تک پہنچاتا اور اسے غور وفکر پر مجبور کرتا ہے، یہ جمعیت اس سے عاری؛ بلکہ عاجز ہے، مزید برآں یہاں کے حالات بھی اجازت نہیں دیتے کہ "جمعیت" فریق بنے، جمعیت کے مختلف ذیلی شعبے ہیں، جن میں سب سے اہم "مجلس العلماء" ہے، اسے ہندوستان کا "دارالقضاء" بلکہ "دارالافتاء" سمجھنا چاہیے۔

پورے کانگو میں (Muslim foundation M,F,C congo) کا کام سب سے زیادہ ہمہ گیر، مقبول، دوررس اور مثبت نتائج کا حامل ہے، یہ ہندوستانی؛ بلکہ صحیح تر لفظوں میں گجراتی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے، جس کا کام ہمہ جہت اور نفع بخش ہے۔

اللہ تعالی گجراتی مسلمانوں کو جزائے خیر دے کہ وہ جہاں بھی پہنچتے ہیں "معاد کو معاش" سے وابستہ کر دیتے ہیں، خواہ وہ امریکی شہر ہو یا افریقی صحرا، ہر جگہ یہ لوگ تلاش معاش کے ساتھ کوئی ایسا نمایاں دینی کام ضرور کرتے ہیں جو دوسروں کے لیے بھی مثالی،

قابل تقلید اور نمونہ ہوتا ہے۔

یادرکھے گا تمھیں بھی زمانہ اختر
شرط یہ ہے کہ کچھ کام نرالے تو کرو

دارالعلوم الایمان اور مدرسة الهداة:

ایم، ایف،سی کی نگرانی میں یوں تو کئی مدارس ومکاتب اور مساجد دینی ودعوتی خدمات میں مشغول ہیں؛ لیکن ان میں سب سے اہم "دارالعلوم الایمان" اور "مدرسۃ الداۃ" ہے دارالعلوم کی تاسیس 2007 ء میں عمل میں آئی، اس میں فی الوقت شعبۂ تحفیظ ،اعدادیہ تا دورۂ حدیث شریف کی تعلیم جاری وساری ہے، قلیل مدت میں یہاں سے ایک درجن کے قریب علما وحفاظ سند فراغت حاصل کر چکے ہیں جو ملک وبیرون ملک میں نمایاں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مدرسۃ الہداۃ ایک غیر اقامتی عربی درس گاہ ہے، جس میں تقریباً 800 طلباوطالبات اپنی علمی تشنگی بجھاتے ہیں، مدرسے میں سات سالہ نصاب ہے، اس مدت میں طلبا نورانی قاعدہ تا مکمل ناظرہ قرآن کریم، دروس اللغۃ العربۃ (تینوں حصے) اور اسلامیات کے 6 حصے مکمل کرتے ہیں، تکمیل کے بعد ان میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دوسروں کی بھی دینی رہنمائی کرسکیں اور انھیں کفر و اسلام کا فرق سمجھا سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود اس "ارض تثلیث" میں اعتقادی اور عملی طور پر مسلمان رہیں۔

تعلیم بالغان کا بھی خصوصی نظم ہے، جس میں بصد شوق وذوق ہر شام 150 کے قریب احباب شریک ہوتے ہیں، فقہ شافعی کی تدریس اور ایک ترتیب میں عربی زبان وادب کی تعلیم ناچیز سے بھی متعلق ہے۔

ایم، ایف، سی کے ماتحت دار الیتامی اور دارالبنات بھی ہیں، سارے طلباوطالبات خواہ وہ دارالعلوم کے ہوں یا مدرسہ اور دار الیتامی کے اسکول ضرور جاتے ہیں، جن کے سارے اخراجات ایم ،ایف،سی سے متعلق ہیں، یہ تنظیم اپنے بچوں کی مکمل کفالت کرتی ہے۔

بچوں کے یونیفارم، ان کے کھانے پکانے کے لیے مسالہ جات اور دیگر ضروری اشیا ہندوستان ہی سے آتی ہیں؛ کیوں کہ یہاں گرانی بہت ہے، حالاں کہ زیادہ تر مصنوعات ہندوستانی ہی ہیں ،جو سامان ہندوستان میں 100 روپے کا ملتا ہے وہ لازماً یہاں 500 روپے کا آتا ہے، فی الوقت یہاں کے 1600 روپے ہندوستانی 65 روپے کے مساوی ہیں، بچوں کے لیے کتابیں عام طور سے ہندوستان، پاکستان، مصر اور سعودی عرب سے قیمتاً منگائی جاتی ہیں جو بحری راستے سے اس دور ترقی میں بھی پانچ چھ مہینے میں پہنچتی ہیں۔

دعوتی مواقع:

ماضی میں یہاں خواہ جو رکاوٹیں رہی ہوں؛ لیکن ابھی دعوتی مواقع پوری طرح فراہم ہیں، ہندوستان جیسی زہر آلود فضا نہیں کہ اگر خاندان کا کوئی فرد اسلام کے دامن رحمت میں آجائے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے، فی الوقت یہاں پیدائشی اور پشتینی مسلمانوں سے زیادہ نومسلم گھرانے ہیں جن کے بھائی بہن اور ماں باپ اب بھی عیسائیت پر قائم ہیں؛ پر مذہب کی بنیاد پر ان میں باہمی کوئی عداوت نہیں؛ بلکہ ماں عیسائی ہوتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کو بخوشی مسلمان ہوجانے کی اجازت دے دیتی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی جماعت سے وابستہ ہیں، ان کی جماعتیں بھی نکلتی رہتی ہیں، بندہ بھی گاہے بگاہے چلا جاتا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ بے چارے کام کے "صحیح منہج" سے واقف نہیں، اور حقیر بھی اس راہ کا کوئی منجھا ہوا راہی نہیں کہ ان کی خاطر خواہ رہنمائی کرسکے، گو "مالیر کوٹلہ" میں چلہ کشی کر چکا ہے۔

پورکانگو میں 400 کے آس پاس مساجد ہیں جن میں سے بیشتر اپنی غربت کی وجہ سے عہد قدیم کی یاد دلاتی اور دعوتی کاموں سے خالی ہیں، مجھے یہاں آئے چار مہینے ہو چکے ہیں، اس دوران انڈیا کی پہلی جماعت آئی ہے جس کے تاثرات یہ ہیں کہ "اس ملک میں تو روزانہ سو جماعتیں آنی چاہیے"۔

بے خودی میں کھو گئے افسانہ در افسانہ

ہم : واقعات نوک قلم پر آتے اور صفحات پر بکھرتے اور نقش ہوتے چلے گئے، حالات لکھے جا چکے، اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ داعیان اسلام کے قافلے اٹھیں اور جوق در جوق یہاں آئیں، جو کنگولیوں کے لیے روحانی غذا کی فراہمی کے ساتھ مادی وسائل کا بھی بندوبست کریں، مقامی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کی اتنی فراوانی ہو کہ کوئی باشندہ اس سے محروم نہ رہے، اس سلسلے میں جدید ذرائع ابلاغ سے بھی بھرپور کام لیا جائے، جگہ جگہ مکاتب و مدارس، مساجد ومعابد، شفاخانے اور رفاہی ادارے قائم کیے جائیں اور ان سب کا خرچ بیرونی مسلمان اپنے ذمے لیں، پھر (ان شاء اللہ):

شب گریزاں ہوگی آخر جلو خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغم توحید سے

☆☆☆

مآخذ ومصادر:

(اس مضمون کی تیاری میں زیادہ تر نیٹ سے استفادہ کیا گیا ہے، ذیل میں چند اہم ویب سائٹس اور لنس ذکر کی جاتے ہیں)

(1) www.aljazeera.net بعنوان: جمورۃ الونغو الدمقراطۃ .....بانات ساسۃ

(2) qiraatafrican.com بعنوان: الحرا السلام والنس ف دولۃ الونغو الدمقراطۃ

(3) www.almursal.com بعنوان: م بلغ عدد سان جمورۃ الونغو؟

(4) www.elshaab.com بعنوان: مفت الونغو ف حوار مع محرر الشعب

(5) www.al–forqan.net بعنوان: السلام ول دن ساوشق طرق ل الونغو الدمقراطۃ

(6) muslimconditions.com بعنوان: الونغو الدمقراطۃ: قرار من السلطات بمنع ارتداء النقاب بالمان العامۃ

(7) ar.m.wikipedia.org بعنوان: السلام ف جمورۃ الونغو الدمقراطۃ

(8) ar.m.eikipedia.org بعنوان: المسیحۃ ف جمورۃ الونغو الدمقراطۃ

(9) pk dunya.com. بعنوان: ایڈز کی ابتدا کانگو کے شہر کنشاسا سے

(10) 10mottoday.com

چند اہم مصادر جن سے کانگو کے خصوصی احوال جانے جا سکتے ہیں:

1 الذاعات التصر ۃ، متبۃ التراث السلام، القارۃ 1991م

2 السلام ف مواجۃ عداء، توفق وبۃ، مجلۃ المجتمع، العدد: 48، التارخ: 2/5/1980م

3 تقرر: وضع السلام والمسلمن ف جمورۃ الونغو الدمقراطۃ، عداد: الشیخ عبدالل بالثارو آخرن، منظمۃ الدعوۃ السلامۃ، الخرطوم، 2011م

4 سالب المنصّر ن ف الصدّ عن السلام ف فرقا وطرق مواجتا، (رسالۃ دتورا) نورالدن عوض الرم برام، جامعۃ المام محمد بن سعود السلامۃ، 1423ھ

5 الوضاع التعلمۃ للقلات المسلمۃ ف فرقا، الطب زن العابدن محمد، دراسات فرقۃ، مرز البحوث والدراسات الفرقۃ، جامعۃ فرقا العالمۃ، العدد: 26، دسمبر: 2001م

6 فرقا والطماع الغربۃ، محمود السد، الناشر: مؤسسۃ جامعۃ الشباب

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

''عالم اسلام'' اور ''تصویر وطن''

حنیف خان

اس وقت ملک میں بہت رسائل وجرائد نکل رہے ہیں ، کچھ سہ ماہی ہیں، کچھ ماہانہ اور کچھ سالانہ، ندائے اعتدال دوسرے زمرے میں آتا ہے، جس کے مدیر جواں سال عالم دین ڈاکٹر طارق ایوبی ہیں۔ڈاکٹر طارق ایوبی کا مدیر ہونا کوئی اہم واقعہ نہیں ہے، جب کوئی رسالہ نکلتا ہے تو کوئی نہ کوئی مدیر تو ضرور ہوتا ہے، کیونکہ رسائل کی یہ تکنیکی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، کسی بھی رسالہ کا سب سے اہم اداریہ ہوتا ہے، رسائل وجرائد میں میں قانونی چارہ جوئی سے بچنے کے لئے ایک سطر لکھی جاتی ہے کہ'' شائع مضامین میں ظاہر کی گئی آرا سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے'' لیکن اس میں اداریہ شامل نہیں ہوتا ہے۔اداریہ مدیر کے قلم سے ہوتا ہے جو اس رسالہ کی پالیسی کے مطابق ہوتا ہے، ایسے میں اداریوں اور مدیر کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے، اس میں ظاہر کی گئی آرا سے کوئی بھی رسالہ کنارہ کش نہیں ہوسکتا ہے۔اتنی طویل تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کیونکہ میرے سامنے دو کتابیں ''تصویر وطن'' اور ''عالم اسلام'' ہیں، جو ڈاکٹر طارق ایوبی کے اداریوں کا مجموعہ ہیں۔ان میں وہ چنگاریاں ہیں جن میں اتنی صلاحیت ہے کہ ایوان حکومت کو جلا کر خاکستر کردیں، ہیں تو چنگاریاں مگر ان کا دائرہ ہندستان سے بڑھ کر مصر ولبنان، شام وایران، عراق ویمن، امریکہ ویورپ سب ہیں، ڈاکٹر طارق ایوبی کے پاس ایسا دل ہے جس میں زمانے کا درد ہے، لیکن وہ صرف دل سے ہی کام نہیں لیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کو بصیرت بھی دی ہے، جس کی وجہ سے جب وہ اپنا درد دل بیان کرتے ہیں تو وہ صرف ان کا نہیں ہوتا بلکہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''یہ بھی میرے دل میں تھا'' وہ خالص جذباتیت میں نہیں بہتے ہیں لیکن جذباتیت کو وہ سم قاتل تصور کرتے ہوئے دعوت فکر و عمل دیتے ہیں۔اداریئے ہمیشہ وقت اور حالات کے مطابق سپرد قلم کئے جاتے ہیں اس لئے دیگر مضامین کے برعکس ان کے کارآمد ہونے کا دورانیہ تھوڑا کم ہوتا ہے، یہ بات طارق ایوبی کے اداریوں میں بھی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں سے سے حالات کا نہ صرف جائزہ لیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے بتائے گئے نسخوں پر عمل کرکے حالات کے رخ کو موڑا بھی جاسکتا ہے، اور طارق ایوبی کے اداریوں کی یہی وہ خوبی ہے جو دوسرے رسائل کے اداریوں سے ممیّز کرتی ہے۔طارق ایوبی لاگ لپیٹ سے کوئی کام نہیں لیتے ،ان کی ڈکشنری میں مصلحت نام کا کوئی لفظ نہیں ہے، بے باکی ان کی شخصیت کا وصف ہے جو ان کے قلم سے عیاں ہے۔قاری جب ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کریگا تو اس کے سامنے ملک اور عالم اسلام کے حالات بالکل کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگیں گے، وہ حالات کا جب جائزہ لیتے ہیں تو صرف حالات ہی نہیں بیان کرتے ہیں اور اگر صرف اتنا ہی کرتے تو کوئی کمال کی بات نہیں تھی کیونکہ حالات تو سب کے سامنے ہوتے ہیں، کچھ اس کی زد میں ہوتے ہیں تو کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کررہے ہوتے ہیں، اہم بات تو یہ ہے کہ یہ حالات پیدا کیسے ہوئے، ان کے پس پردہ کون سی ذہنیت کارفرما ہے، اور ان کے مقاصد کیا ہیں، جو حالات پیش آئے ہیں وہ کس بات کا پیش خیمہ ہیں، اگر ان کا تدارک نہ کیا

گیا تو آئندہ کے حالات کیسے ہوں گے،اوران حالات کو سازگار کیسے کیا جاسکتا ہے وہ ان سب باتوں پر توجہ دیتے ہیں۔حالات کا جائزہ لینے میں طارق ایوبی کسی کی پرواہ نہیں کرتے ،نہ صلے کی تمنا ہوتی ہے نہ ستائش کی خواہش ،جس طرح سے وہ غیروں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتے ہیں اسی طرح وہ اپنوں کی لاپرواہیوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ایسے لوگ جو جبہ و دستار والے ہیں لیکن خود غرضی اور مفاد پرستی میں وہ قوم و ملت کا سودا کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے ان کے چہروں پر پڑی نقابیں بھی وہ بڑی سفاکی سے کھینچتے ہیں۔کسی بھی ادارے سے نکلنے والا جریدہ چند باتوں کا لحاظ کرتا ہے جس میں اس کے اپنے فرقہ کے بڑے بزرگ اور ادارے شامل ہوتے ہیں جن پر نکیر نہیں کی جاتی ہے لیکن طارق ایوبی اس سے بھی بے نیاز ہیں،وہ مسلمانوں کو صرف ایک پلیٹ فارم پر دیکھنا چاہتے ہیں،اسی لئے جس مکتبہ فکر سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کے اعیان پر بھی کھلے لفظوں میں تنقید کرتے ہوئے ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ جس ادارے نے ان کو علم سے بہرہ ور کیا، جب ان کو لگا کہ وہ اپنے مقصد اصلی کی طرف توجہ نہیں دے رہا ہے تو اس کو بھی نہیں بخشا،اس کے مقاصد یاد دلاتے ہوئے بتایا کہ اس وقت وہ اپنی طے کردہ راہ سے بھٹک رہا ہے۔ ملک میں بہت سی جماعتیں اور تحریکیں ہیں جن کا ظاہری مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود ہو مگر سب کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں ،جب انہوں نے دیکھا کہ ان تحریکات سے وابستہ لوگ ملی کاز کے بجائے اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دے رہے ہیں تو ان کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دی۔

''تصویر وطن''میں 47 مضامین ہیں، یہ کتاب ملکی حالات پر لکھے گئے اداریوں کا مجموعہ ہے ،ان مضامین میں چار باتیں سب سے زیادہ اہم ہیں۔(1)مسلمانوں کی زبوں حالی(2)سیاست دانوں کی ریشہ دوانی اور اپنوں کی کج فہمی(3)اتحاد امت (4)تعلیم کے ذریعہ فلاح و بہبود کا راستہ۔بیشتر مضامین میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے لئے سیاسی حالات کی عدم موافقت اور ملی ٹھیکیداروں کی مفاد پرستی کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے،ڈاکٹر طارق ایوبی کا تجزیہ بالکل درست ہے ،انہوں نے اس کے دلائل بھی دیئے ہیں اس کے ذریعہ ان کا مقصد صرف یہ رہا ہے کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں اور ان کو معلوم ہو جائے کہ اب عوام بھی ان کے مقاصد سے واقف ہو چکے ہیں،اس لئے اب وہ ملی فلاح و بہبود کے لئے کام کریں اور غیروں کی ریشہ دوانیوں میں کل پرزہ نہ بنیں۔انہوں نے آر ایس ایس اور سنگھ کے ایجنڈے کو بھی قارئین کے سامنے رکھا ہے،ادھر جب سے بھاجپا اقتدار میں آئی ہے اس کے طریقہ کار اور اسرائیل سے اس کے تعلقات پر طارق ایوبی نے بہت کھل کر لکھا ہے، اس طرح انہوں نے حکومت وقت کے مذموم مقاصد سے اپنے قارئین کو واقف کرایا ہے تاکہ حالات خراب ہونے سے قبل وہ پیش بندی میں لگ جائیں جس کے لئے انہوں ے دو راستے بتائے ہیں کہ اولاً سبھی جماعتوں اور تحریکوں میں اختلافات کے بجائے اتحاد ہونا چاہئے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے،اس اتحاد کے لئے سبھی کو اپنے ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ایک پلیٹ فارم پر آنا پڑے گا۔طارق ایوبی نے اپنے اداریوں میں سب سے زیادہ اسی پہلو پر زور دیا ہے جو بڑی خوش آئند بات ہے۔ثانیاً انہوں نے تعلیم کو اہم گردانتے ہوئے مکاتب اور اسکول و کالج کے قیام پر زور دیا ہے۔اس کتاب میں ایک مضمون ''موجودہ صورتحال اور چند تجاویز'' شامل ہے، جو حاصل کتاب ہے،جس میں انہوں نے پہلے موجودہ صورت حال کو پیش کرنے کے بعد 9 تجاویز قوم وملت کے سامنے رکھی ہیں، وسیع النظری کا مظاہرہ،سیاست میں سبھی تحریکات اور جماعتوں کو کسی ایک پر اعتبار کرنا ہی ہوگا،تعلیمی اداروں میں نظام اور نصاب میں اصلاح، بچوں کی تربیت، اسکولوں کا قیام، مادیت سے اجتناب یعنی

خواہشات سے دور ہونا، مدارس اور معاشرہ میں ربط اور خدمت خلق، سماج کی فکری تربیت۔ان میں کچھ نکات طویل المدت ہیں اور کچھ قلیل المدت،لیکن اگر ان تجاویز پر عمل کر لیا جائے تو یقینی طور سے صرف 50 برس میں حالات بدل جائیں گے۔کتاب میں کچھ مضامین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سبب ہے،اگر آج کہیں بھی مسلمان کسی عہدے پر فائز ہیں تو ان میں 80 فیصد اسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دین ہے،خود ڈاکٹر طارق ایوبی بھی اسی چمن کے بلبل رہنے کا شرف رکھتے ہیں لیکن جب یہاں کے وائس چانسلر نے ایسا قدم اٹھایا جو اصول وضوابط کے منافی تھا تو اس پر انہوں نے بڑے سخت لفظوں میں تنقید کرتے ہوئے اس کے پس پردہ کارفرما عوامل کی طرف بھی اشارے کیے کہ دراصل یہ کام اس لئے کرایا جا رہا ہے تا کہ اس یونیورسٹی کا اقلیتی درجہ چھینا جا سکے اور اسے بحال نہ ہونے دیا جائے،اسی طرح دو مضامین فکری بحران پر ہیں۔

اسی یونیورسٹی کے ایک شخص نے امت مسلمہ کے فکری بحران کی بات کہی اور خود سب سے بڑا مفکر بن کر جب سامنے آیا تو کسی بھی عالم دین نے اس پر توجہ نہیں دی لیکن طارق ایوبی کا قلم میدان میں آ گیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص ایسی جگہ ہے جہاں تحصیل علم کے لئے آنے والے طلبا دینی معلومات میں کمزور ہوتے ہیں،اگر اس غلط فکر کا سد باب نہ کیا گیا تو نئے ذہنوں کو پراگندہ اور مسموم کر دیگا،انہوں نے اس خود ساختہ مفکر کی ایک ایک فکر کا جائزہ لیا اور پھر ہوا یوں کہ امت مسلمہ کی فکر پر سوالیہ نشان لگانے والا خود زد میں آ گیا یعنی ''خود اپنے دام میں صیاد آ گیا'' یہ طارق ایوبی کے قلم کی بڑی خوبی ہے۔

مجموعی طور سے 256 صفحات کی یہ کتاب حالات حاضرہ کو سمجھنے اور لائحہ عمل تیار کرنے کا ایک بہت اہم وسیلہ ثابت ہوسکتی ہے،لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو آج یہ ہے کہ طارق ایوبی کی بات نقار خانے میں طوطی کی ثابت ہوتی رہی ہے سب اپنی چال چل رہے ہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ ایک شخص بڑی بے جگری سے اپنا خون جگر صرف کر کے سوتوں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہے شاید اللہ کو اس کی یہی ادا پسند آ جائے۔

دوسری کتاب ''عالم اسلام'' ہے۔جو 228 صفحات پر مشتمل ہے،اس کتاب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ڈاکٹر طارق ایوبی کی نظر اقصائے عالم پر رہتی ہے،وہ عام مدیروں کی طرح اخبارات کی خبروں پر خاص توجہ نہیں دیتے ہیں بلکہ ان خبروں کے منابع و مصادر کو دیکھتے ہیں،طارق ایوبی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ سبھی ایجنسیوں پر یہودیوں کا قبضہ ہے،وہ ایسی خبریں ہی نشر کرتی ہیں جن میں ان کے اپنے مفادات پوشیدہ ہوتے ہیں،عالم اسلام کی خبروں اور حالات کے تجزیہ میں اس بات پر وہ خصوصی توجہ دیتے ہیں،دوسری بات یہ کہ عالم عرب کے جید علما سے خود ان کے اپنے ذاتی روابط ہیں،جن سے وہ سوشل میڈیا سے جڑے رہتے ہیں اور اصل حالات کا پتہ چلتا رہتا ہے،اپنے تجزیوں میں وہ اس میڈیم کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔طارق ایوبی عالم اسلام میں انتشار پر ماتم کناں ہیں،لیکن یہ صرف سینہ کوبی تک محدود نہیں وہ اسباب وعوامل پر نظر رکھتے ہیں،عالم عرب سے ان کو حد درجہ محبت ہے کیونکہ ایمان کی باد بہاری وہیں سے چلی،نفوس قدسیہ نے اسلام کے لئے جانیں قربان کیں اور خلق خدا کو جہنم کی آگ سے بچایا،عرب اور اہل عرب سے ان کو خاص لگاؤ ہے لیکن ان کا یہ لگاؤ بھی سچ اور حق کہنے اور لکھنے سے باز نہیں رکھ سکا،اپنے اداریوں میں وہ مسلسل شاہان عرب کے افعال واعمال پر نکیر کرتے ہیں،خادم الحرمین کا منصب کتنا جلیل القدر ہے،جب شاہ سلمان کی تاج پوشی ہوتی ہے تو ان کی شخصیت اور مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے بڑی امیدیں وابستہ کرتے ہیں،لیکن وہی جب اسلام مخالف کام کرتے ہیں اور امریکیوں و

یہودیوں کے آلہ کار بن کر مصر کی اخوانی حکومت کو تباہ و برباد کرتے ہیں سبھی لوگ خاموش رہتے ہیں لیکن ان کا قلم آگ اگلنے لگتا ہے، پھر ان کی نظر میں خادم الحرمین کا منصب بھی اہمیت نہیں رکھتا اور لکھتے ہیں کہ یہ اصطلاح تو عوام کے جذبات سے کھلواڑ کے لئے استعمال کرتے ہیں، یمن کے قضیہ میں پوری سنی دنیا کے علماء سعودی اتحاد کے ساتھ ہیں لیکن طارق ایوبی کی بالغ نظری دیکھئے کہ وہ ابتدا میں ہی اس اندیشے کا اظہار کر دیتے ہیں کہ یہ تو شاید اپنی حکومت کی بقا کے لئے اٹھایا جانے والا قدم ہے۔ کیونکہ اس کے ان کے پاس دلائل ہیں جو وہ قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ شام میں بشاری حکومت کے ظلم واستبداد اور وہاں کے عوام کی مجبوری کو بیان کرتے ہیں، اس ضمن میں وہ پوری تاریخ بیان کر جاتے ہیں تا کہ منظر نامہ کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے، اسی طرح مصر اور فلسطین کے تعلقات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں، عرب قومیت کے فتنہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح جمال عبد الناصر یہودیوں کے آلہ کار بن گئے اور حسنی مبارک نے ان کے ایجنڈے کو آگے بڑھایا۔ وہ مصر اور تیونس کے انقلاب پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ اعلاء کلمۃ اللہ ان کا مقصد اور مطمح نظر ہے، طارق ایوبی ہندستان اور عالم عرب پر ایک ساتھ اور یکساں نظر رکھتے ہیں۔ ترکی صدر رجب طیب اردگان کے بارے میں جس طرح انہوں نے ابتدا میں پیش گوئی کی وہ دھیرے دھیرے سب سچ ثابت ہو رہی ہے اور آج پوری ملت ترکی کی جانب دیکھ رہی ہے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی کی کتاب ''عالم اسلام'' 29 اداریوں پر مشتمل ہے۔ میرا مقصد صرف ان دونوں کتابوں کا تعارف کرانا ہے کہ یہ دونوں مجموعے ملک اور عالم اسلام کے حالات کی تفہیم میں کتنا اہم ہیں، اس لئے زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا ہوں ورنہ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ان کتابوں کے محتویات پر مفصل مضامین لکھے جائیں۔ طباعت دیدہ زیب ہے اور قیمت بھی نہایت مناسب ہے، اول الذکر کی قیمت 180 روپئے ہے جس کو مرکز ثقافت وتحقیق علی گڑھ نے شائع کیا ہے جبکہ ثانی الذکر کی قیمت محض 160 روپئے ہے جسے مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے۔

آخر میں مولف کی توجہ دو باتوں کی جانب منعطف کرانا چاہتا ہوں، پہلی بات یہ کہ ہر مضمون کے آخر میں اس شمارہ کی تفصیل دینی چاہئے تھی جس میں وہ شامل تھا، اس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ آئندہ کسی بھی طالب علم کو پریشانی نہ ہوتی اور کل جب اس پر کوئی کام ہوتا تو اصل ماخذ کا حوالہ بھی اس کے سامنے ہوتا، مجھے امید ہے کہ یہ کمی دوسرے ایڈیشن میں دور کر لی جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اکثر وبیشتر اداریے 5 صفحات یا اس سے زیادہ کے ہیں، بہت کم اداریے ایسے ہیں جو دو صفحات کے ہیں، کچھ اداریے تو بہت زیادہ طویل ہیں، شاید اداریے اتنے طویل نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ اداریے مختصر اور جامع ہوتے ہیں، مگر طارق ایوبی ایجاز کے بجائے اطناب سے کام لیتے ہیں جو میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ آج کا جو دور ہے وہ بڑا برق رفتار ہے، جس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے، مضامین طویل ہوں تب بھی کوئی بات نہیں ہے لیکن اداریے میرے خیال سے دو صفحات سے زیادہ نہیں ہو چاہئے اگر کوئی ایسا موضوع ہے جو طوالت کا متقاضی ہے تو اس کے لئے آپ اداراتی صفحہ کے بجائے دوسرے صفحات کا انتخاب کریں۔ آپ کسی بھی زبان کی کوئی بھی میگزین اٹھا کر دیکھ لیجئے مضامین طویل ہو سکتے ہیں مگر اداریے نہیں کیونکہ یہ صفحہ بڑا اہم ہوتا ہے جس میں ادارے کی پالیسی کے مطابق ہی لکھنا ہوتا ہے اور ہمیشہ لکھنا ہوتا ہے، ایسے میں قاری طوالت کو نہیں برداشت کر سکتا ہے، امید کہ اس جانب بھی توجہ دی جائے گی۔

☆☆☆

رب کعبہ کی قسم سچ ہے

(م۔ق۔ن)

ایک رات حضرت عمرؓ شہر کی دیکھ بھال کے لیے نکلے تو ایک مکان سے کسی مسلمان کے قرآن پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ''سورۂ طور'' پڑھ رہے تھے، آپؓ نے سواری روکی اور کھڑے ہوکر سننے لگے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے۔'' بے شک آپ کے رب کا عذاب واقع ہوکر ہی رہے گا، اس کو کوئی دفع کرنے والا نہیں'' تو حضرت عمرؓ کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے'' رب کعبہ کی قسم سچ ہے'' پھر آپؓ سواری سے اترے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے یہاں تک کہ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ اس آیت کو سننے کے بعد ایسے بیمار ہوئے کہ کم وبیش ایک ماہ تک بستر علالت پر پڑے رہے، یہ تو صحابی رسول امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کا حال تھا لیکن خود جس ذات اقدس رسول برحق اور نبی امی پر قرآن اترا ذرا ان کی کیفیت ملاحظہ کیجئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: مجھے قرآن سناؤ، میں نے عرض کیا کہ آپؐ مجھ سے سننا چاہتے ہیں جبکہ قرآن پاک آپ پر نازل ہوا ہے آپؐ نے فرمایا ہاں! جی یہی چاہتا ہے کہ قرآن کسی اور سے سنوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں میں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کردی، جب اس آیت کریمہ پر پہنچا۔ "فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید" (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے) تو آپؐ نے فرمایا: اب بس کردو! میں نے آپؐ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کی مبارک آنکھوں میں آنسو بہہ رہے تھے (بخاری شریف) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسی تاثیر اور جاذبیت رکھی ہے جو دنیا کی کسی کتاب میں نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو پڑھنے ہی نہیں بلکہ سننے والے پر بھی ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اللہ کے نبی تو معصوم تھے قرآن مجید خود آپ پر نازل ہوا آپؐ نے ایک ایک آیت کا مطلب اور مفہوم صحابہ کو بتایا اور سمجھایا لیکن اس کے باوجود آپ کا جی چاہتا تھا کہ کسی اور سے قرآن سنیں، لیکن آج ہم مسلمانوں کی غفلت کا کیا حال ہے، ہم قرآن کی تلاوت سے کتنے دور ہیں، جب ہم قرآن کی تلاوت کے لئے وقت نہیں نکال سکتے ہیں تو پھر قرآن کے معانی اور مفاہیم کو سمجھنے کے لئے ہمیں فرصت کہاں؟ آج پوری نوجوان نسل (چند فیصد کو چھوڑ کر) شعور قرآنی کو حاصل کرنے سے کوسوں دور ہے اور نہ ہی ہمارے اندر کبھی یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم قرآن کے پیغام کو سمجھیں اور قرآن میں غوطہ زن ہوکر اس کے اسرار رموز کو حاصل کریں، جب تک ہم اپنے اندر یہ جذبہ اور تڑپ پیدا نہیں کریں گے قرآن کی تاثیر سے محروم رہیں گے۔

☆☆☆